دین کی نشر واشاعت کا ثواب انسان کو موت کے بعد بھی ملتا رہتا ہے

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ ‹‹اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهٗ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ اِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِیَةٍ اَوْ عِلْمٍ یَنْتَفِعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٌ صَالِحٍ یَدْعُوْلَهٗ››

[رواه مسلم: كتب الوصية،باب ما يلحق الانسان من الثواب بعد وفاته]

’’حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’جب انسان مرتا ہے تو اس کا عمل تین چیزوں کے علاوہ منقطع ہو جاتا ہے

① ......صدقہ جاریہ

② ......علم جس کے ذریعہ لوگوں کو نفع حاصل ہو

③ ......نیک اولاد جو مرنے والے کے لیے دعا کرے۔‘‘

(اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

تین بنیادی باتیں

دین کی تبلیغ کا آغاز تین بنیادی باتوں سے ہوا

(ا) اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان اور شرک سے کلی طور پر اجتناب

(ب) محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان اور آپ ﷺ کی اطاعت کا حکم

(ج) آخرت پر یقین اور اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی پر پختہ ایمان

مشرکین عرب اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مانتے تھے اور سخت مشکلات میں صرف اسی کی طرف رجوع کرتے تھے مگر اس کے ساتھ انہوں نے بزرگوں کے مجسمے اپنے ہاتھوں سے تراش رکھے تھے اور بیت اللہ جسے اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے توحید کا مرکز بنایا تھا اس میں بھی انہوں نے متعدد بت سجا رکھے تھے اور کہا کرتے تھے: مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى [زمر:۳] ''ہم تو ان بتوں کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ تک ہماری رسائی کرادیں۔''

قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر ان کے اس شرک کا رد کیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی صداقت وامانت پر انہیں یقین تھا وہ آپ کے اخلاق عالیہ سے بھی متاثر تھے مگر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ رسول ایسا بھلا کیونکر ہوسکتا ہے جو شاہراہوں پر چلتا پھرتا ہوا اور ان کی طرح کھانا کھاتا پیتا ہو، اسے مافوق البشر ہونا چاہیے۔ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ [الفرقان:۷] ''وہ کہتے یہ کیسا رسول ہے جو کھاتا پیتا اور اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔''

ان کی عقل میں یہ بات نہ آتی تھی کہ یہی رسول وہی ہوسکتا ہے جس کی حیات طیبہ ان کے لیے ہر معاملہ میں نمونہ ہو۔

تیسری بات یہ کہ قیامت پر ان کا یقین نہیں تھا وہ اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے ان کے خیال میں ہزاروں صدیوں کی پہنایوں میں ان کے مشت غبار بکھرے ہوئے ذرے کون جمع کرے گا۔ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ [المؤمنون:۸۲] وہ کہتے ''کیا جب مر کر مٹی ہوجائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہم کو پھر زندہ کرکے اٹھایا جائے گا۔''

قرآن حکیم نے اس کا متعدد مقامات پر جواب دیا کہ رب قدیر ہر بات پر قادر ہے، جو خالق تمہیں نیست سے ہست میں لایا، وہ ہر چیز کو دوبارہ کرنے پر قادر ہے، اس سورۃ مبارکہ میں اس کی قدرتوں کا مشاہدہ کرایا گیا ہے، عرش سے فرش تک ہر جگہ اور ہر سمت اس کی قدرت عیاں ہے، جس طرح لیل ونہار کی آمد ورفت میں اس کی قدرت ظاہر ہے، اسی طرح دنیا کے بعد آخرت بھی یقینی ہے، دنیا دار العمل ہے تو آخرت دار الجزاء ہے۔ [الفرقان: پارہ عم، ص:۳۷]

فہرست

اپنی تعریف مت کرو

قال اللّٰہ تعالی ﴿ فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴾ [النجم:۳۲]

''آپ اپنی پاکیزگی بیان نہ کرو وہی پرہیزگاروں سے خوب واقف ہے۔''

تعریف کرنے والوں کی سزا

عن المقداد بن الاسود قال: اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَحْثِيَ فِيْ وُجُوْهِ الْمَدَّاحِيْنَ التُّرَابَ ۔ [مسلم: ۳۰۰۲]

''مقداد بن اسود سے روایت ہے انھوں نے کہا، اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا: تعریف کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈالو۔''

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ کا بیان ہے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: اے محمد (ﷺ)! میں نے کہا میں حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب تو نماز پڑھے تو یہ دعا پڑھ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِيْنِ وَاِذَا اَرَدْتَّ بِعِبَادِكَ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِیْ اِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ ۔ [ترمذی: ۳۲۳۳، صحیح صححہ الالبانی]

''اے اللہ! میں تجھ سے درخواست گزار ہوں کہ مجھے بھلائیوں کو انجام دینے، برائیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور مساکین سے محبت کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اور جب تو اپنے بندوں پر کوئی آزمائش نازل کرنا چاہے تو مجھے اس آزمائش سے بچا کر اپنے پاس بلا لینا۔''

یہ ہماری نہیں صلیب کی جنگ ہے

اداریہ — حافظ احمد شاکر

دیگر ممالک کی اسمبلیوں اور اراکین اسمبلی کا تو ہمیں علم نہیں کہ ان کے چناؤ یا ان کے اسمبلیوں میں آنے کا کیا معیار ہوتا ہے لیکن ہم اپنی اسمبلیوں اور ان کے ممبران کو دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ اسمبلی کا رکن بننے کے لیے:

①......مضبوط برادری، ②......تگڑی سیاسی پارٹی، ③......ڈنڈی پٹی (یعنی دھونس) کا حامل ہونا، ④......تقدس مآبی، ان سب کے ساتھ اخراجات کے لیے...... جائز و ناجائز......سرمایہ، جھوٹے وعدے کرنا اور لتھی چڑھی سے بے نیاز ہونا اہم ترین صلاحیتیں ہیں۔ باقی رہا......حقیقی معنوں میں......خدمت، ایثار، تو ان ''غیر اہم صفات'' کے حامل ممبران ایک ہاتھ کی انگلیوں جتنے بھی شاید نہ ہوں گے۔

دہشت گردی کے نام پر ارض پاک و افغانستان پر مسلط کی گئی جنگ جسے پاکستان کی جنگ یا افغانستان ...... کے مفادات ...... کی جنگ کہنے کا تقریباً دس سال سے ڈھول پیٹا جا رہا ہے وہ جنگ کس کی ہے؟ فنکار صلیبی حکمرانوں کے مونہہ سے اس کو صلیبی جنگ کہلوا چکے ہیں۔ یہ جنگ صلیبی بھی ہے لیکن تاریخ کی روشنی اور فن کاروں کی کارستانیوں پر غور کیا جائے تو یہ جنگ صلیبی ہی نہیں صلیبی بھی ہے یعنی یہودی دماغ صلیب کو سامنے لا کر خود پس چلمن بیٹھا ہے۔ ہمارے اسمبلی ممبران کی اکثریت کو تو اللہ کے فضل سے نہ علم جیسی چیز کی ضرورت ہے اور نہ بساط عالم کی سیاست پر غور کرنے کی فرصت کیوں کہ ہمارے ہاں کی سیاست کی حیثیت تو تماش بینوں کے جلو میں گھری طوائف کی سی ہے کہ ہر سیاست دان حسب طاقت اس سے استمتاع...... وقتی فائدہ......اٹھانے کی تاک میں ہوتا ہے۔ وگرنہ یہ سیاست دان اگر ماضی کی تاریخ نہ سہی حال کی عالمی سیاست کو پڑھ ہی لیں تو انہیں اندازہ بلکہ علم ہو جائے کہ غیر مسلم اقوام ان کے بارے میں کیا کہتی اور کیا سوچتی ہیں۔ سن تو سہی جہاں میں ہے ترا فسانہ کیا کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ قیامت قریب ہو رہی ہے۔ نبی ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ قیامت کے قریب دجال خراسان سے ستر ہزار یہودیوں کے جلو میں نمودار ہوگا۔ اس حدیث شریف کو سامنے رکھ کر دیکھا اور سوچا جائے تو اسرائیل کا ایران کی طرف خشمگیں نظروں سے ہمیشہ دیکھتے رہنا اور اس پر حملہ کے لیے بار بار پھدکنا اور پھڑکنا سمجھ میں آ جاتا ہے۔ دجال کی سرکوبی بھی چوں کہ امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھوں ہی ہونی ہے۔ اس لیے یہودی اس کے تدارک کے لیے خراساں (جس کا کچھ حصہ ایران میں ہے کچھ افغانستان میں اور کچھ نو آزاد شدہ مسلم ریاستوں میں) کو گھیرے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حکمت بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ وہ یہودیوں کو نو آزاد شدہ ریاستوں میں زمین کا لالچ (کہ بہت سی ریاستوں میں یہودی ۹۰ سالہ لیز زمینیں حاصل کر چکے ہیں) دے کر خراسان کے علاقہ میں جمع فرما رہا ہے۔ جب کہ کٹر یہودی سابق امریکی وزیر خارجہ کسنجر امریکا کو یہ مشورہ دے چکا ہے کہ امریکی مفادات کے لیے پاکستان افغانستان اور ایران میں امن نہ ہونے پائے، چوں کہ دجال نے خراسان سے یہودیوں کو لے کر نکلنا ہے اس لیے امت محمدیہ کی سہولت کی خاطر اللہ تعالیٰ یہودیوں کو خراسان ہی کے اردگرد جمع کر رہا ہے۔ طاغوت کی سرزمین پاک و افغانستان کے میدان جنگ بنانے کی حکمت عملی بھی اب آشکار ہونے لگی ہے۔ ماضی میں صیہونیوں نے پہلے روس کو تخت کا جھانسہ دے کر اس کا تختہ کر دیا اب اس نے امریکا کو بے پناہ مالی امداد دے کر اس خطہ میں جنگ کا الاؤ دہکا دیا ہے کہ اس میں عیسائی مرا تو بھی اس کا دشمن مرا اور مسلمان مرا تو بھی دشمن مرا۔ مسلمان حکمرانوں ''خصوصاً اس جنگ کے متاثر شدہ علاقوں کے...... ماضی،

حال اور مستقبل کے......کو تو اس جنگ کے صلیبی ہونے کی سمجھ ہی نہیں آ رہی اور نہ ہی شاید وہ سمجھنا چاہتے ہیں لیکن دنیا بھر کی عیسائی حکومتیں اور ان کے حکمران امریکا کی زیر قیادت دہشت گردی کی اس نام نہاد جنگ کو صلیبی سمجھ کر لڑ رہی ہیں۔لیکن ہمارے حکمران نہ صرف اس سے غافل ہیں بلکہ وہ اس کے درست ہونے کے یہاں تک قائل ہو چکے ہیں کہ وہ بھارت کو خطرہ جاننے اور اس سے تحفظ کی بجائے دہشت گردی کے عنوان پر، شاید سبقت لسانی میں، بھارت کو......مشترکہ دشمن رکھنے والا......حلیف کہنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔جب کہ دیر، سوات، مالاکنڈ اور وزیرستان میں پگڑیوں، گھنے بالوں، لمبے کرتوں اور بروت وریش کے حامل ان دہشت گردوں میں ایک کثیر تعداد بلاختنہ......کافر......دہشت گردوں کے پائے جانے کا اخبارات میں تذکرہ اب نمایاں طور پر آنے لگا ہے حتیٰ کہ اب سید منور حسن امیر جماعت اسلامی نے عالمی سطح پر بھارت کے ملوث ہونے کو طشت از بام کرنے کا مطالبہ بھی کر دیا ہے۔لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وطن عزیز ایسے سدھائے ہوؤں کے سپرد ہو چکا ہے جو گاجر اور کوڑے کے استعمال سے پہلے ہی سائس کی ہوا میں لہراتی چابک دیکھتے ہی سیدھے ہو جاتے ہیں۔اس لیے جب تک اذن نہ ملے تب تک شاید مشترک دشمن کا زبان پر نام لانے میں مشرقی روایات ان کے آڑے آتی ہوں۔ہم نے کچھ ہی شمارے قبل انہی صفحات میں عرض کیا تھا دہشت گردوں، شدت پسندوں یا جنگ جوؤں کا لبادہ اوڑھے جو غیر مسلم دہشت گرد زندہ یا مردہ پکڑے جائیں تو حکومت کی مصلحت اگر اظہار میں کہیں آڑے آتی ہو تو عساکر پاکستان حکومتی آداب ملحوظ رکھتے ہوئے عوام کو اعتماد میں لیں عوام افواج پاکستان کی وفاداری اور خلوص پر سو فیصد اعتماد کرتے ہیں۔

میاں صاحب! اب بادشاہ نہیں بادشاہ گر بنیں!

معلوم یہ ہوتا ہے کہ پابندیاں اٹھنے، مقدمات سے بریت اور عوام کی چاہت سے وزارت عظمیٰ کی رال جناب میاں صاحب کے مونہہ سے پھر ٹپکنے لگی ہے جو ہمارے خیال میں کوئی دانائی، تجربہ اور پختہ فکری کی دلیل نہیں۔میاں صاحب نے ۸ سالہ جلاوطنی کا جو کشٹ کاٹا تھا اس سے ان کی استقامت کا کچھ نہ کچھ مقام بنا تھا لیکن میاں صاحب مشرف سے تحریری معاہدہ نہ ہونے کی ۹ سال تک جو رٹ لگاتے رہے اس تحریری معاہدے کو سندھ حکومت نے نہ صرف افشا بلکہ پریس میں جاری کر کے ان کے مقام کو گہنا دیا ہے۔تاہم ہمارے ملک کے سیاست دان بڑے ''حوصلہ مند'' ہوتے ہیں اس لیے ان کی صحت پر ان باتوں کا اثر شاید کچھ نہ ہوگا۔لیکن یاد رہے تاریخ سب کچھ محفوظ کر رہی ہے۔اب عرض کرنے کی ضرورت میاں صاحب کا وہ انٹرویو پڑھ کر محسوس ہوئی جس میں میاں صاحب نے تیسری بار وزیراعظم بننے پر جذبہ خدمت کا اظہار کیا ہے ہمارے خیال میں میاں صاحب کی مونہہ سے خاص طور ارادۂ خدمت کی آڑ اس لیے نہیں جچی کہ اخباری اطلاعات کے مطابق وہ اب بھی غرباء، بیمار، مستحقین طلبائے علم اور مظلوموں کی ہر ممکن خدمت میں کوتاہی نہیں کرتے کہ ان کے تایا مرحوم اور والد مرحوم کا اندازِ حیات یہی تھا۔انسانی کمزوریاں اپنی جگہ لیکن اس خاندان کی فلاحی خدمات سے کسی کو انکار نہیں۔دنیا کی شاید ہی کوئی نعمت ہو جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا نہ کی ہو پھر حکمرانی کی خاردار چادر یا چھید والی چھتری کی انہیں کیا ضرورت ہے؟ میاں شہباز شریف جو اور جس طرح عوام کی فلاح و بہبود کی جو خدمات سرانجام دے رہے ہیں وہ ان کے اور ان کے خاندان کی نجات کے لیے شاید کافی ہیں۔میاں صاحب کو جب اقتدار کے بغیر جملہ مقتدرانہ آداب وسہولیات میسر ہیں تو انہیں مزید اقتدار کی خواہش سے خود کو آزاد کر دینا چاہیے۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اب تک ان کو جس عزت سے نوازا ہے وہ اس کو سنبھالیں اور خود کنگ بننے کی بجائے کنگ میکر بن جائیں۔میاں صاحب کو چاہیے کہ وہ جن طبقوں کی خوشنودیٔ طبع حاصل کر کے یا جن بیساکھیوں کے سہارے یا جن واسطوں سے حجلۂ اقتدار میں آنا چاہتے ہیں وہ اس طوطا چشم کے فیض یافتہ ماضی قریب وبعید کے حکمرانوں کا انجام دیکھ کر عبرت پکڑیں کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوئے۔ہم بھی چوں کہ میاں صاحب سے کسی نہ کسی درجے میں حسن ظن رکھنے والوں میں سے ہیں اس لیے یہ گزارش کر دی کہ وہ معاہدے کے افشا ہی کو کافی سمجھ کر مزید رسوائی سے بچ جائیں۔

معاشرتی مسائل

مفرورلڑکیوں کا نکاح اور ہماری عدالتیں؟ ❸

ایک سلگتا ہوا معاشرتی مسئلہ

تالیف وترتیب: حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

⑤......بعض حضرات کہتے ہیں، جیسا کہ ایک بہت محترم فاضل بزرگ نے اپنی کتاب ''مجموعہ قوانین اسلام'' میں لکھا ہے کہ مسئلہ زیر بحث میں جو آیات واحادیث ہیں وہ واضح نہیں ہیں اور ہر گروہ ان سے اپنے اپنے مسلک پر استدلال کرلیتا ہے۔ چناں چہ فقہاء کا ایک گروہ چند احادیث کو اس استدلال کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ ولایت صحت نکاح کی شرط ہے، جب کہ دوسرا گروہ ایسی احادیث پیش کرتا ہے جن سے نکاح کے لیے ولایت کا شرط ہونا ثابت نہیں ہے۔ نتیجے کے طور پر جتنی آیات اور احادیث اس بارے میں وارد ہوئی ہیں، وہ محتمل علیہ ہیں۔ ان کے معنی اور وسعت میں اختلاف ہے اور ان سے موافق ومخالف دونوں مفہوم نکالے جاسکتے ہیں۔

لیکن ہم عرض کریں گے کہ دلائل شرعیہ میں تعارض ممکن نہیں۔ جہاں ظاہری الفاظ میں تعارض نظر آتا ہو، وہاں حقیقت میں تعارض نہیں ہوتا وہاں جمع وتطبیق ممکن ہے اور جہاں صحیح اور ضعیف دو قسم کی احادیث ہوں، ان کے درمیان بھی تعارض تسلیم نہیں کیا جاتا۔ کیوں کہ صحیح احادیث کے مقابلے میں ضعیف احادیث قابل استدلال ہی نہیں۔ ایسے موقعوں پر صرف صحیح احادیث ہی مدار استدلال ہوں گی۔ اور مسئلہ زیر بحث میں صحیح اور واضح احادیث ہم نقل کرآئے ہیں جو مسئلے کے اثبات کے لیے کافی ہیں۔ جہاں تک آیات قرآنیہ کا تعلق ہے، ان کی بابت بھی یہ دعویٰ صحیح نہیں، وہ بھی احادیث کی طرح واضح ہیں، جیسا کہ اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ نیز شان نزول کی صحیح ترین روایت بخاری کے بعد تو کسی قسم کے اشتباہ یا ابہام کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

اسی طرح بعض آیات قرآنیہ میں جو نکاح کی نسبت عورتوں کی طرف کی گئی ہے جس سے بعض لوگوں نے عدم ولایت پر استدلال کیا ہے، ہم وضاحت کرآئے ہیں کہ یہ استدلال صحیح نہیں۔ ان کا مفہوم قرآن کریم کی دوسری واضح آیات اور احادیث کی روشنی میں متعین ہوگا، اور وہ یہی ہے کہ نکاح بہر حال ولی کی اجازت اور رضامندی سے ہی ہوگا۔ قرآن کریم کی آیات میں مبینہ اشتباہ یا ابہام کی توضیح یا ان کے متعدد معانی میں سے کسی ایک معنی کی تعیین کے لیے اگر حدیث کو بنیاد نہیں بنایا جائے گا۔ تو قرآن کو سمجھنا اور عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہوگا، جیسا کہ ہم مختصراً اشارہ کرآئے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ بعض احادیث میں ولی کی اجازت اور رضامندی کے بغیر کیے گئے نکاح کو باطل قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ بعض دوسری روایات میں نبی ﷺ نے عورت کی رضامندی حاصل کیے بغیر نکاح کو مسترد فرمادیا اور لڑکی کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار عنایت فرمایا۔ یہ دونوں احادیث ایک دوسرے کے مخالف اور متعارض ہیں۔ تو یہ دعویٰ بھی یکسر غیر صحیح ہے۔ کیوں کہ ان میں کوئی تعارض نہیں ہے، ان دونوں روایات کے مجموعے سے یہ حکم اخذ کیا جائے گا کہ لڑکی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ولی کی اجازت اور رضامندی کے بغیر از خود کہیں نکاح نہ کرے اور ولی کے لیے ضروری ہے کہ وہ جہاں رشتہ کرنا چاہے اس کے لیے لڑکی کی رضامندی بھی ضرور حاصل کرے۔ نہ لڑکی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ ولی کو نظر انداز کرے اور نہ ولی کو لڑکی پر جبر کرنے کی اجازت ہے۔ یہی بات علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ نے ''فیض الباری'' میں بیان فرمائی ہے اور اس کو کئی مثالوں سے واضح بھی فرمایا ہے۔ ان کی گفتگو کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے:

''شارع کا طریقہ یہ ہے کہ اجتماعی معاملات میں وہ طرفین کی رعایت کرتا ہے اور احادیث بھی جانبین کے بارے میں وارد ہوتی ہیں اور اقامت نظم کے لیے یہی طریقہ سب سے زیادہ مناسب ہے۔ اس لیے اس قسم کی جگہوں میں راہ صواب یہی ہے کہ دونوں جانب کی احادیث کو جمع کیا جائے اور ان کے مجموعے سے حکم اخذ کیا جائے اور جو شخص صرف ایک ہی جانب کی حدیث کو سامنے رکھتا ہے وہ شارع کی نصف مراد ہی کو پہنچ پاتا ہے۔ پوری مراد اسے حاصل نہیں ہوتی اور اس کی پوری مراد تو مجموعہ حدیث ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کی ہم یہاں چار مثالیں پیش کرتے ہیں:

①...... زکوٰۃ کا معاملہ ہے۔ جس میں ایک زکوٰۃ دینے والا اور دوسرا لینے والا (سرکاری اہل کار) ہے۔ اس کی بابت جو احادیث آتی ہیں، ان میں ایک طرف نبی ﷺ نے مال داروں کو یہ فرمایا کہ ''تمہارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے والے آئیں گے جنہیں تم ناپسند کرو گے کیوں کہ وہ تم سے زکوٰۃ وصول کریں گے۔ پس اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو انہیں خوش آمدید کہو اور وہ تم سے جو طلب کریں وہ انہیں دے دو۔ اگر وہ انصاف سے کام لیں گے تو ان کا فائدہ اور اگر ظلم کریں گے تو اس کا وبال انہی پر ہوگا۔ لیکن تم انہیں راضی کرو، اس لیے کہ تمہاری زکوٰۃ کا اتمام ان کی رضامندی ہی میں ہے۔''

لیکن جب نبی ﷺ نے زکوٰۃ وصول کرنے والے سرکاری کارندوں سے خطاب فرمایا تو انہیں تاکید فرمائی کہ تم لوگوں سے ان کا نفیس اور قیمتی مال لینے سے اجتناب کرو اور مظلوم کی بددعاء سے بچو۔ اس لیے کہ اس کی پکار اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔ نیز آپ نے فرمایا: ''صدقہ وصول کرنے میں زیادتی کرنے والا ایسے ہے جیسے زکوٰۃ کا انکار کرنے والا۔'' ان دونوں قسم کی احادیث میں غور کیا جائے، پہلی قسم کی احادیث میں زکوٰۃ کی مکمل ادائیگی کو عاملین کی رضامندی پر منحصر کر دیا گیا ہے حتی کہ ان کے ظلم کو بھی برداشت کرنے کی تلقین کی گئی اور دوسری قسم کی احادیث میں کہا گیا ہے کہ عاملین کسی بھی قسم کی زیادتی نہ کریں، ورنہ وہ سخت گناہ گار ہوں گے۔ گویا دونوں طرف سخت احکام دیئے گئے تا کہ اللہ تعالیٰ کی حدوں کی صحیح طریقے سے حفاظت ہو سکے اور ہر فریق اپنے اپنے دائرے میں رہے اس سے تجاوز نہ کرے۔ تمام احادیث میں جمع و تطبیق کا یہی طریقہ ہے۔ [فیض الباری: ۴/۲۸۴، ۲۸۵]

علامہ کاشمیری نے تین مثالیں اور بھی بیان فرمائی ہیں، جنہیں یہاں نقل کرنا باعث طوالت ہے اور اس کے بعد انہوں نے مسئلہ زیر بحث سے متعلق احادیث میں بھی وہی تطبیق دی ہے جسے ہم پہلے بیان کر آئے ہیں اور ان تمام احادیث کے مجموعے سے یہی مراد لیا ہے کہ اولیاء عورتوں کی رضامندی کو اور عورتیں اولیاء کی اجازت کو نظر انداز نہ کریں۔ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ ضروری اور شرعاً مطلوب ہیں، اور ان احادیث کے مابین کوئی تعارض نہیں۔ [صفحہ: ۲۸۶]

علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ کے اس موقف سے ہمارے موقف کی تائید ہو جاتی ہے کہ ولایت نکاح سے متعلقہ آیات واحادیث کے مابین کوئی تعارض نہیں۔ لہٰذا ان کے درمیان تعارض ثابت کرنا دین یا اسلام کی خدمت نہیں۔

قرآن اور احادیث کو نظر انداز کرنے کی خطرناک دعوت:

لیکن ''مجموعہ قوانین اسلام'' کے فاضل مصنف آیات واحادیث میں تعارض باور کرا کے حسب ذیل خطرناک نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

''جب کہ آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی محتمل علیہ ہوں اور ائمہ اربعہ کے درمیان نکاح کے جائز اور ناجائز ہونے کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہو تو عامۃ المسلمین کے نزدیک جو قول رائج رہا ہو، اس کو اختیار کرنا چاہیے۔ بشرطیکہ وہ صریح نص کے خلاف نہ ہو اور مصلحت عامہ کے مطابق ہو۔ چناں چہ اس پوری بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شافعیہ کا یہ نظریہ کہ عورت نکاح کی حقیقت سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی اور اس کے نکاح کے لیے ولی کی وساطت ناگزیر ہے۔ دراصل عورت کی آزاد مرضی کو مشروط بنانے اور اس کے ذاتی حق واختیار پر ایک قدغن کے مترادف ہے۔ البتہ مسلم معاشرے کو انتشار سے محفوظ رکھنے کے لیے شرع نے اولیاء کو یہ حق دیا ہے کہ اگر لڑکی نے ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں نکاح کیا ہو یا مہر مثل سے کم پر کیا ہو تو ولی عدالت میں تنسیخ نکاح کا دعویٰ کر سکتا ہے اور عدالت معقول شرعی وجوہ کی بناء پر نکاح کو فسخ کر سکتی ہے۔'' [مجموعہ قوانین اسلام: ۱]

مذکورہ دعوت کے خوف ناک نتائج:

یہ سارا نتیجہ تضادات اور غلطی ہائے مضامین کا آئینہ دار ہے۔ایک تو آیات واحادیث کومحتمل علیہ قرار دے کرانہیں ایک طرف رکھ دینے کا مشورہ ہے، جب کہ یہ بات بھی خلاف واقعہ ہے، ہم تفصیل کے ساتھ واضح کرآئے ہیں کہ قرآنِ کریم کی متعدد آیات مسئلہ ولایت میں نص صریح کی حامل ہیں۔اور اس طرح کئی احادیث صحیحہ بھی نص قطعی کی حیثیت رکھتی ہیں اور انہی سے آیات قرآنیہ کا مفہوم ومصداق بھی واضح اور متعین ہوجاتا ہے بالخصوص شانِ نزول کی روایات سے۔ان آیات واحادیث کوقطعاً محتمل علیہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

دوسرے، یہ فرمانا کہ ائمہ اربعہ کے درمیان اختلاف کی وجہ سے ان کے مسالک بھی قابل عمل نہیں ہیں۔حالاں کہ آخر میں جا کر خود امام شافعی کے مقابلے میں امام ابوحنیفہ ؒ کے قول کو اختیار فرمایا ہے، یہ فکری اور عملی تضاد کی ایک واضح مثال ہے۔

تیسرے نمبر پر یہ کہنا کہ عامۃ المسلمین کے نزدیک جوقول راجح رہا ہو، اسے اختیار کیا جائے، عجیب بات ہے۔عامۃ المسلمین سے موصوف کی کیا مراد ہے؟ یہ واضح نہیں ہے، اگر عام لوگ مراد ہیں تو وہ کسی قول کو راجح کس طرح قرار دیں گے؟ کیا ان کے اندر اس کی استعداد وصلاحیت ہوسکتی ہے؟ کیوں کہ دلائل شرعیہ کا موازنہ کرکے ہی کسی قول کو راجح کہا جاسکتا ہے۔کیا عامۃ المسلمین یہ کام کر سکتے ہیں؟ اور اگر اس سے مراد اکثریت ہے تو اکثریت تو ان ائمہ وفقہاء کی ہے جوصحت نکاح کے لیے ولی کی اجازت کوضروری قرار دیتے ہیں۔کیوں کہ ائمہ ثلاثہ اسی بات کے قائل ہیں، بلکہ ہمارے خیال میں تو علامہ انور شاہ کاشمیری کی صراحت کے مطابق جب امام ابوحنیفہ ؒ بھی لڑکی اور ولی دونوں کی رضامندی کوضروری سمجھتے ہیں تو ائمہ ثلاثہ سے بھی امام صاحب کا خاص اختلاف باقی نہیں رہ جاتا ہے۔کیوں کہ ائمہ ثلاثہ بھی دونوں کی رضامندی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔اس کا تقاضا تو پھر یہ ہے کہ مسئلہ ولایت کوراجح قرار دے کر اس کو اختیار کرنا چاہیے۔علاوہ ازیں یہی قول نص کے مطابق ہے اور اس سے تمام احادیث میں جمع وتطبیق بھی ہوجاتی ہے۔جب کہ اس کے برعکس قول، نص صریح آیات قرآنیہ اور حدیث ((لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ)) کے خلاف ہے۔

رہی بات مصلحت عامہ کی تو اس وقت جوصورتِ حال ہے وہ یہ ہے کہ لڑکیاں اپنے آشناؤں کے ساتھ گھروں سے فرار ہوکر والدین کی اجازت کے بغیر خفیہ شادیاں کررہی ہیں اور یوں والدین اور خاندان کی عزت کو خاک میں ملا رہی ہیں۔ایک اسلامی معاشرے میں مسلمان ہوتے ہوئے کیا یہ صورتِ حال قابل برداشت یا حوصلہ افزائی کے لائق ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو اس کے انسداد اور حوصلہ شکنی کا کیا طریقہ ہے؟

ولی کی اجازت اور رضامندی کوصحت نکاح کے لیے ضروری قرار دینا یا لڑکی کواس سے آزاد کردینا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ مصلحت عامہ کس میں ہے؟ لڑکیوں کو والدین سے باغی کرنے میں یا ان کا تابع فرمان بنا کر رکھنے میں؟

مذکورہ فاضل مصنف ان دونوں سوالوں پر غور کرنے کی زحمت گوارا فرمالیں، تو یقیناً ان کا جواب یہی ہوگا کہ مصلحت عامہ کا تقاضا تو یہی ہے کہ لَو میرج کے بڑھتے ہوئے رجحان کے سدباب کے لیے ولایت کی اہمیت کوتسلیم کیا جائے نہ کہ اسے ختم کردیا جائے۔اسی طرح لڑکی کی رضامندی کوبھی ضرور ملحوظ رکھا جائے اور جبر واکراہ کا راستہ قطعاً اختیار نہ کیا جائے۔یہی اعتدال کا راستہ ہے جو شریعت نے تجویز کیا ہے۔افسوس ہے کہ فاضل مصنف جیسے محترم اور صاحب علم وفضل بزرگ بھی شریعت کی اس راہ اعتدال کو نظر انداز کرکے ایسا راستہ اختیار کرنے کی تلقین فرما رہے ہیں جس کا نتیجہ دو اور دو چار کی طرح واضح طور پر ہلاکت وبربادی اور خاندانی نظام کی تباہی ہے۔

موصوف کا یہ فرمانا کہ شافعیہ کا یہ نظریہ ہے کہ عورت نکاح کی حقیقت سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی اور اس کے نکاح کے لیے ولی کی وساطت ناگزیر ہے، شافعیہ کے نقطۂ نظر کی یہ تعبیر محل نظر ہے۔کیوں کہ شافعیہ کے اس نقطہ نظر کی بنیاد حدیث رسول ہے نہ کہ عقلی تجزیہ۔علاوہ ازیں یہ صرف شافعیہ کا ہی نقطہ نظر نہیں ہے، بلکہ امام مالک، امام احمد بن حنبل، سعید بن مسیّب، حسن بصری، قاضی شریح، ابراہیم نخعی، عمر بن عبدالعزیز، سفیان ثوری، اوزاعی، عبد اللہ بن مبارک، ابن شبرمہ،

اسحاق، ابن حزم، ابن ابی لیلیٰ، طبری، ابوثور اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہم سمیت تمام محدثین کا مسلک ہے اور صحابہ میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عمر، حضرت ابن مسعود اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم وغیرہم کا بھی یہی مسلک ہے۔

[ملاحظہ ہو، فقہ السنہ: ۲/۱۱۳]

امام ابن المنذری کی صراحت کے مطابق تمام صحابہ کا یہی مسلک ہے۔ اس لیے اس مسلک کو صرف شوافع کی طرف منسوب کرنا بھی خلافِ واقعہ ہے، ہاں اسے جمہور علماء وفقہاء وائمہ وصحابہ کا مسلک اگر وہ قرار دیتے تو بالکل صحیح اور واقع کے مطابق ہوتا۔ لیکن اس حقیقت کے اظہار کے ساتھ موصوف کے لیے اپنی یہ بات کہنی مشکل تھی کہ

''(شافعیہ کا یہ نظریہ) دراصل عورت کی آزاد مرضی کو مشروط بنانے اور اس کے ذاتی حق واختیار پر ایک قدغن کے مترادف ہے۔''

کیوں کہ یہ وہی بات ہے جو آج کل مغربی مفکرین اور ان کے مشرقی شاگرد، عورت کی آزادی کے جواز کے لیے کہہ رہے ہیں۔ عورت کو ستر وحجاب کا پابند بنانا، اس کو اس کے دائرۂ عمل تک محدود رکھنا، اس کو مردوں کے دوش بدوش آنے سے روکنا اور دیگر مردانہ سرگرمیوں کو اس کی فطرت کے خلاف قرار دینا، ان مغرب زدگان اور ان کے آقاؤں کی نظر میں عورت کی آزادی کے خلاف اور اس کے حق واختیار پر ایک قدغن ہے۔

کیا محترم مصنف کو اس نظریئے سے اتفاق ہے؟ اگر اتفاق ہے پھر تو موصوف کی مذکورہ بات قابل فہم ہے اور اگر انہیں اس سے اتفاق نہیں ہے اور ہمیں یقین ہے کہ انہیں اس سے اتفاق نہیں ہوسکتا، اس لیے ہم موصوف سے عرض کریں گے کہ جہاں وہ ان تمام پابندیوں کو اس لیے غلط نہیں سمجھتے کہ یہ پابندیاں شریعت نے عورت کی عزت اور اس کے تقدس کی حفاظت اور معاشرے کو فساد سے بچانے کے لیے عائد کی ہیں۔ وہ مرد کے حق ولایت کی پابندی کو بھی ایسا ہی سمجھ لیں کیوں کہ اس کا مقصد بھی وہی ہے جو دیگر پابندیوں کا ہے۔ اس لیے اسے عورت کی آزادی کے خلاف اور اس کے اختیار پر قدغن قرار نہ دیں۔

ایک نہایت غیر معقول نظریہ:

شافعیہ کے نظریئے کی تردید کے بعد، جو دراصل جمہور کا مسلک ہے، فاضل مصنف نے فرمایا کہ ''البتہ مسلم معاشرے کو انتشار سے محفوظ رکھنے کے لیے شرع نے اولیاء کو یہ حق دیا ہے کہ اگر لڑکی نے ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں نکاح کیا ہو یا مہر مثل سے کم پر کیا ہو تو ولی عدالت میں تنسیخ نکاح کا دعویٰ کرسکتا ہے۔''

ہم موصوف سے عرض کریں گے کہ اولیاء کا یہ حق کیا عورت کی آزادی کے خلاف اور اس کے ذاتی حق واختیار پر ایک قدغن عائد کرنے کے مترادف نہیں ہے؟ جمہور کا مسلک آپ کے نزدیک اس لیے قابل قبول نہیں کہ اس سے عورت کی آزاد مرضی مشروط اور اس کا حق واختیار سلب ہوجاتا ہے۔ لیکن جس مسلک کو آپ نے راجح قرار دیا ہے یہ قباحت تو اس میں بھی موجود ہے، اگر یہ قباحت ہے؟ فرق صرف یہ ہے کہ جمہور کے مسلک میں مسلم معاشرے کو انتشار سے بچانے کے لیے ابتداء ہی میں بروقت اقدام تجویز کردیا گیا ہے کہ کوئی لڑکی ولی کی اجازت کے بغیر نکاح ہی کرے اور نہ ولی ہی عورت پر جبر کرے۔ اور آپ کہتے ہیں کہ پہلے لڑکی کو فساد برپا کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ البتہ بعد میں اس کا ازالہ عدالتوں کے ذریعے سے کیا جائے۔ گویا بات ایک ہی ہے، لیکن سیدھے طریقے سے ناک پکڑنے کی بجائے، ہاتھ کو پیچھے سے گھما کر لایا جائے اور پھر ناک کو پکڑا جائے۔ کیا یہ بات ؎

آنچہ کند دانا ، کند ناداں ، ولیک بعد از خرابی بسیار

ضرب المثل کی مصداق نہیں؟ اور کیا اس لحاظ سے جمہور کا مسلک زیادہ صحیح اور دانش مندی پر مبنی نہیں؟ یہ کیا ضروری ہے کہ پہلے لڑکی کو آزادی دی جائے اور پھر اسے سلب کرنے کے لیے دونوں خاندانوں کو عدالتی کھکھیڑ میں ڈال کر ان کی ذلت ورسوائی کا اہتمام کیا جائے۔ عورت کے حق واختیار پر پابندی ہی عائد کرنی ہے تو کیا یہ بہتر نہیں کہ ابتداء ہی میں اس کا اہتمام کرلیا جائے تاکہ انتشار وفساد برپا ہی نہ ہو۔

اسی لیے ہم نے پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب پھر نہایت ادب سے

التماس کریں گے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور جمہور کے مسلک کو ایک دوسرے کے خلاف باور کرانے کی بجائے، اس میں نکتۂ اتفاق تلاش کیا جائے کہ اس وقت الحاد اور مغرب زدگی کا طوفان اہل اسلام سے اسی بات کا تقاضا کر رہا ہے اور یہ نکتۂ اتفاق الحمدللہ موجود ہے۔ اسی کو نمایاں اور اختیار کیا جائے اور وہ یہ ہے کہ علامہ انور شاہ کاشمیری کے بقول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کا مآل یہ ہے کہ نکاح میں ولی اور لڑکی دونوں کی رضامندی ضروری ہے اور یہی مسلک جمہور کا ہے۔ اس اعتبار سے ان میں باہم کوئی اختلاف نہیں۔ اس لیے فقہ حنفی کے حوالے سے نوجوان لڑکیوں کو ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنے کی اجازت دے کر مسلم معاشرے کو انتشار سے دوچار نہ کیا جائے۔ سانپ کے بچے کو پال پوس کر جوان کر کے مارنے سے بہتر ہے کہ پالنے میں ہی اس کا سر کچل دیا جائے۔

دوسری بات ہم فاضل مصنف سے یہ پوچھیں گے کہ آپ نے بیان تو حنفی مسلک کیا ہے کہ اگر وہ غیر کفو میں شادی کر لے یا مہر مثل سے کم میں شادی کر لے۔ تو اولیاء کو عدالتی مرافعہ کا حق حاصل ہے، لیکن اسے منسوب شرع کی طرف کیا ہے کہ شرع نے اولیاء کو یہ حق دیا ہے۔ اگر واقعی یہ حق شریعت نے دیا تو یہ قرآن کریم کی کس آیت یا کس حدیث سے ثابت ہے؟ اگر آپ ان دو شرطوں کو نص شرعی سے ثابت نہیں کر سکتے تو پھر انہیں شریعت کی طرف منسوب کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ شریعت کا جو حکم ہے، جو صحیح احادیث سے ثابت ہے، وہ تو یہ ہے کہ ولی کی اجازت کے بغیر کیا گیا نکاح باطل ہے اور اگر ولی نے لڑکی کی رضامندی کو نظر انداز کر کے لڑکی کا نکاح کر دیا ہے تو لڑکی کو پنچایت یا عدالت کے ذریعے سے فسخ نکاح کا حق حاصل ہے۔ ان دلائل شرعیہ میں کفو اور غیر کفو یا مہر کی کمی بیشی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ شریعت نے تو اولیاء کو غیر مشروط ولایت کا حق دیا ہے، اور اسی غیر مشروط حق ولایت کو تسلیم کر کے ہی مسلم معاشرے کو انتشار و فساد سے بچایا جا سکتا ہے۔ اگر آپ واقعی شریعت کا حکم ماننے کے لیے تیار ہیں اور معاشرے کو انتشار سے بچانا چاہتے ہیں تو مرد کے حق ولایت کو اس طرح تسلیم کر لیں جس طرح شریعت نے اسے دیا ہے۔

جمہور علماء وفقہاء اور ائمہ محدثین نے مذکورہ آیات واحادیث سے ہی ولایت نکاح کا اثبات کیا ہے:

بہر حال مذکورہ آیات واحادیث کو رد کرنے کے لیے جو تاویلات وتوجیہات پیش کی جاتی ہیں، وہ سب غیر معقول ہیں۔ اسی لیے ہم نے ان کی وضاحت کرنی ضروری سمجھی ہے۔ ان نصوص شرعیہ سے مسئلہ زیر بحث کے اثبات میں کوئی شک نہیں رہتا۔ چناں چہ علمائے اسلام نے ہر دور میں ولایت نکاح کے لیے انہی آیات واحادیث سے استدلال کیا ہے۔ ہم اپنی بات کی تائید کے لیے ذیل میں مزید چند جدید وقدیم وفقہاء کے اقوال نقل کرتے ہیں، تاکہ بات بالکل واضح ہو جائے۔

① ......امام بخاری، جن کی فقاہت مسلمہ ہے، انہوں نے اپنی صحیح بخاری میں باب باندھا ہے: **باب من قال لا نکاح الا بولی** ''اس بات کا بیان جو اس بات کا قائل ہے کہ ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں''، پھر اس باب میں پہلے سورۂ بقرہ کی آیت: ۲۳۲ اور آیت: ۲۲۱ اور سورۂ نور کی آیت: ۳۲ سے استدلال کیا ہے، (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔)

اس کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ روایت جس میں چار قسم کے نکاحوں کا اور پھر اسلام میں صرف ولایت والے نکاح کے باقی رکھنے کا بیان ہے، اور حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی وہ روایت بیان کی ہے جس میں آیت ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ﴾ کی شان نزول کا تذکرہ ہے۔ دیکھیے
صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب من قال لا نکاح الا بولی

② ...... شارحین حدیث نے امام بخاری رحمہ اللہ کے ان استدلالات کو، جو آیات واحادیث سے انہوں نے کیے، تسلیم کیا ہے، کسی نے نہیں کہا کہ یہ استدلالات غلط ہیں۔ حتی کہ علامہ عینی اور علامہ کاشمیری نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا، بلکہ علامہ کاشمیری نے تو فی الجملہ امام بخاری رحمہ اللہ ہی کی تائید کی ہے۔ ((كَمَا مَرَّ))

③ ......امام ابن حزم لکھتے ہیں:

((وَلَا يَحِلُّ لِلْمَرْأَةِ نِكَاحٌ كَانَتْ ثَيِّبًا أَوْ بِكْرًا، إِلَّا بِإِذْنِ وَلِيِّهَا الْأَبِ، أَوِ الْإِخْوَةِ أَوِ الْجَدِّ أَوِ الْأَعْمَامِ

...... فَـاِنْ أَبٰـى اَوْلِيَـآؤُهَـا مِنَ الْاِذْنِ لَهَـا، زَوَّجَهَـا السُّلْطَانُ)) [المحلى، رقم: ١٨٢٥، كتاب النكاح]

''عورت کے لیے چاہے وہ بیوہ (شوہر دیدہ) ہو یا باکرہ (کنواری) اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ ولی باپ یا بھائی یا دادا یا چچا...... ہوں گے۔ اگر یہ اولیاء عورت کو نکاح کی اجازت دینے سے انکار کریں گے تو حاکم وقت اس کا نکاح کرے گا۔'' (یعنی پھر وہ ولایت کا حق ادا کرے گا۔)

اس کے بعد امام ابن حزم ((برهان ذلك)) (اس مسلک کی دلیل) فرما کر وہی آیات واحادیث ذکر کرتے ہیں، جن سے ہم نے استدلال کیا ہے اور امام بخاری ؒ نے بھی کیا ہے۔

④......امام ابن تیمیہ ؒ فرماتے ہیں:

((وَهٰـذَا بِـخِلَافِ الْـوَلِيِّ، فَإِنَّهُ قَدْ دَلَّ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ فِيْ غَيْـرِ مَـوْضِعٍ وَالسُّنَّةُ فِيْ غَيْرِ مَوْضِعٍ، وَهُوَ عَادَةُ الصَّـحَـابَةِ، إِنَّـمَـا كَـانَ تُـزَوِّجُ النِّسَآءَ الرِّجَالُ، لَا يُـعْـرَفُ أَنَّ امْرَأَةً تُزَوِّجُ نَفْسَهَا، وَهٰذَا مِمَّا يُفَرِّقُ فِيْهِ بَيْـنَ الـنِّـكَـاحِ وَمُتَّـخِـذَاتِ اَخْدَانٍ، وَلِهٰذَا قَـالَـتْ عَائِشَةُ، لَا تُزَوِّجُ الْمَرْأَةُ نَفْسَهَا فَاِنَّ الْبَغِيَّ هِيَ تُزَوِّجُ نَـفْسَهَا)) [مجموع فتاوىٰ شيخ الاسلام احمد بن تيمية: ٣٢/ ١٣١]

''ولی کا مسئلہ ایسا ہے جس پر قرآن نے کئی جگہوں پر دلالت کی ہے اور اسی طرح سنت نے بھی متعدد جگہ رہنمائی کی ہے، اور صحابہ کا معمول بھی یہی تھا، ان میں مرد ہی عورتوں کی شادی کا بندوبست کرتے تھے، ان میں قطعاً یہ رواج نہیں تھا کہ عورت خود اپنا نکاح کرلے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس سے نکاح اور خفیہ آشنائیاں کرنے والی عورتوں کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ اسی لیے حضرت عائشہ ؓ فرماتی تھیں، عورت اپنا نکاح خود نہ کرے، اس لیے کہ اپنا نکاح خود کرنا بدکار عورتوں کا شیوہ ہے۔''

اس کے بعد امام صاحب نے وہی آیاتِ قرآنی پیش کی ہیں جن سے امام بخاری ؒ اور دیگر ائمہ محدثین نے استدلال کیا ہے۔

⑤......امام قرطبی ؒ مذکورہ آیات واحادیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

((فقد تعاضد الكتاب والسنة على ان لا نكاح الا بولى)) [تفسير قرطبى: ٧٢/٣]

''کتاب وسنت اسی بات کی تائید کرتے ہیں کہ ولی کے بغیر نکاح جائز نہیں۔''

ایک اور روایت، جو ابن حبان نے اپنی صحیح میں نقل کی ہے، جس میں ولی کے ساتھ دو عادل گواہوں کی موجودگی بھی ضروری قرار دی گئی ہے، نقل کر کے لکھتے ہیں:

((وَلَا يَـصِـحُّ فِـي الشَّـاهِدَيْنِ غَيْرَ هٰذَا الْخَبَرِ، وَإِذَا ثَبَـتَ هٰـذَا الْـخَبَرُ فَقَدْ صَرَّحَ الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ بِأَنْ لَّا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ)) [ص:٧٣]

''دو گواہوں کے بارے میں صرف یہی حدیث صحیح ہے اور جب یہ حدیث ثابت ہوگئی تو یقیناً کتاب وسنت سے یہ واضح ہوگیا کہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح صحیح نہیں۔''

⑥......ایک جدید فاضل محقق، سید سابق مصری لکھتے ہیں:

((ذَهَـبَ كَثِيْـرٌ مِّـنَ الْـعُلَمَآءِ اِلٰى أَنَّ الْمَرْأَةَ لَا تُزَوِّجُ نَـفْسَهَـا وَلَا غَيْـرَهَـا، وَإِلٰـى أَنَّ الـزَّوَاجَ لَا يَـنْعَقِدُ بِـعِبَارَتِهَا، اِذْ أَنَّ الْوِلَايَةَ شَرْطٌ فِيْ صِحَّةِ الْعَقْدِ، وَإِنَّ الْـعَـاقِدَ هُوَ الْوَلِيُّ ...... وَاحْتَجُّوْا لِهٰذَا)) [فقه السنة: ١١١/٢]

''علماء کی اکثریت اسی طرف گئی ہے کہ عورت خود اپنا نکاح کرسکتی ہے نہ کسی اور عورت کا۔ نیز یہ کہ اس کی عبارت (کہنے) سے نکاح بھی منعقد نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ عقد نکاح کی صحت کے لیے ولایت شرط ہے اور یہ عقد باندھنے والا صرف ولی ہے۔ ان علماء نے اپنی اس رائے کے لیے ان دلائل سے حجت

پکڑی ہے۔'' (اس کے بعد انہوں نے وہی آیات واحادیث ذکر کی ہیں۔)

⑦......ایک اور شامی فاضل ڈاکٹر وھبۃ الزحیلی لکھتے ہیں:

((رَأْيُ الْجُمْهُوْرِ، فَهُوَ أَنَّ النِّكَاحَ لَا يَصِحُّ إِلَّا بِوَلِيٍّ وَلَا تَمْلِكُ الْمَرْأَةُ تَزْوِيْجَ نَفْسِهَا وَلَا غَيْرَهَا، وَلَا تَوْكِيْلَ غَيْرِ وَلِيِّهَا فِيْ تَزْوِيْجِهَا، فَإِنْ فَعَلَتْ وَلَوْ كَانَتْ بَالِغَةً عَاقِلَةً رَشِيْدَةً، لَمْ يَصِحَّ النِّكَاحُ، وَهُوَ رَأْيُ كَثِيْرٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ كَابْنِ عُمَرَ وَعَلِيٍّ وَابْنِ مَسْعُوْدٍ وَابْنِ عَبَّاسٍ وَأَبِيْ هُرَيْرَةَ وَعَائِشَةَ وَإِلَيْهِ ذَهَبَ سَعِيْدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ وَالْحَسَنُ وَعُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ وَجَابِرُ بْنُ زَيْدٍ وَالثَّوْرِيُّ وَابْنُ أَبِيْ لَيْلٰى وَابْنُ شُبْرُمَةَ وَابْنُ الْمُبَارَكِ وَعُبَيْدُ اللّٰهِ الْعَنْبَرِيُّ وَإِسْحَاقُ وَأَبُوْ عُبَيْدَةَ)) [الفقه الاسلامی وادلته: ۷/ ۱۹٤]

''جمہور علماء وفقہاء کی رائے یہ ہے کہ ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں، اور عورت خود اپنے نکاح کا اختیار رکھتی ہے نہ کسی اور عورت کے نکاح کا۔ نہ کسی عورت کے ولی کے علاوہ، اس کے نکاح میں اس کی وکیل بن سکتی ہے۔ اگر ایسا کرے تو چاہے وہ عاقلہ بالغہ اور سمجھ دار بھی ہو، نکاح صحیح نہیں ہوگا۔ اور یہی رائے اکثر صحابہ وتابعین کی ہے۔'' (آگے ناموں کا ذکر ہے۔)

اس کے بعد انہوں نے بھی وہی احادیث بیان کی ہیں جن سے ولایت نکاح کا اثبات ہوتا ہے۔ ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

((فَلَا يَصِحُّ الزَّوَاجُ إِلَّا بِوَلِيٍّ، لِقَوْلِهِ تَعَالٰى فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ أَنْ يَّنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ قَالَ الشَّافِعِيُّ هِيَ أَصْرَحُ آيَةٍ فِيْ اِعْتِبَارِ الْوَلِيِّ، وَإِلَّا لَمَا كَانَ لِعَضْلِهِ مَعْنًى وَلِقَوْلِهِ ﷺ لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ ...... وَهُوَ لِنَفْيِ الْحَقِيْقَةِ الشَّرْعِيَّةِ بِدَلِيْلِ حَدِيْثِ عَائِشَةَ، أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ بَاطِلٌ بَاطِلٌ ...... فَلَا يَصِحُّ حَمْلُ الْحَدِيْثِ الْأَوَّلِ عَلٰى نَفْيِ الْكَمَالِ، لِأَنَّ كَلَامَ الشَّارِعِ مَحْمُوْلٌ عَلَى الْحَقَائِقِ الشَّرْعِيَّةِ، أَيْ لَا نِكَاحَ شَرْعِيٌّ أَوْ مَوْجُوْدٌ فِي الشَّرْعِ إِلَّا بِوَلِيٍّ)) [کتاب مذکور، ص:۸۲]

''ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں۔ اس لیے کہ اللہ نے فرمایا ہے: ''تم ان عورتوں کو اپنے (طلاق دینے والے) خاوندوں سے (دوبارہ) نکاح کرنے سے مت روکو۔'' امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت ولی کے معتبر ہونے میں سب سے زیادہ صریح ہے۔ کیوں کہ اگر ولی کا اعتبار نہ ہوتو یہ کہنا (کہ تم ان کو مت روکو) بے معنی ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں نبی ﷺ کا فرمان ہے ''ولی کے بغیر نکاح نہیں'' اور یہ حقیقت شرعیہ کی نفی ہے (یعنی شرعاً نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا) اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث ہے کہ ''جس عورت نے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو وہ باطل ہے باطل ہے باطل ہے۔'' اس لیے حدیث کو نفی کمال پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے، اس

لیے کہ شارع کا کلام شرعی حقائق پر محمول ہوتا ہے، یعنی ولی کے بغیر نکاح نہیں، کا مطلب ہے شرعی نکاح نہیں یا شریعت کی رو سے یہ نکاح وجود پذیر ہی نہیں ہوا۔''

⑧......شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں اس پر مختصر بحث کی ہے، انہوں نے بھی حدیث ((لا نکاح الا بولی)) اور مرد کی ولایت وقوامیت والی آیات سے استدلال کرنے کے علاوہ اس امر کی بھی صراحت کی ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں کم عقل اور عاقبت نااندیش ہے، اس لیے عورتوں کے اہل حل وعقد مرد ہی ہیں اور وہی ہونے چاہئیں۔ [دیکھئے حجۃ اللہ البالغۃ: ۲/ ۱۲۷، طبع لاہور]

⑨......صحابہ وتابعین کے اقوال دیکھ لیے جائیں، ان کا مسلک بھی یہی ہے، اور اس کی بنیاد بھی مذکورہ آیات واحادیث ہی ہیں۔

⑩......فقہ شافعی، فقہ مالکی اور فقہ حنبلی میں بھی ولایت کو ضروری قرار دیا گیا ہے اور ان کی بنیاد بھی قرآن وحدیث کے یہی دلائل ہیں جن سے ہم نے استدلال کیا ہے۔ اس کی تفصیل ان کی فقہی کتابوں میں موجود ہے جسے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ حتی کہ فقہ حنفی میں بھی لڑکی اور ولی دونوں کی رضامندی کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد بھی احادیث ہی ہیں، جس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

بہرحال عہد رسالت مآب ﷺ سے تا این دم، مذکورہ قرآنی دلائل اور احادیث کی بنیاد پر بالغ لڑکی کے نکاح کے لیے ولی کی اجازت اور رضامندی کو ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس لیے اس مسئلے سے اعراض وانحراف قرآن وحدیث سے اعراض کے علاوہ امت مسلمہ کے عملی تواتر سے بھی انحراف ہے، جس کی اجازت ایک اسلامی معاشرے میں نہیں دی جاسکتی۔ [جاری ہے]



افادات امام ابن القیم

نماز میں خشوع

ایک واجب مجاہدہ جس کے بغیر نماز مکمل نہیں ہو سکتی!

انتخاب: عمر فاروق السعیدی

اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ فِىْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ...... الخ ﴾ [المومنون: ۱،۲]

''تحقیق اہل ایمان نے فلاح پائی، جو اپنی نمازوں میں خشوع اور عاجزی کرتے ہیں۔''

جب یہ آیات مبارکہ نبی ﷺ پر نازل ہوئیں تو آپ نے فرمایا: ''مجھ پر دس آیتیں نازل ہوئیں ہیں، جس نے ان کا اہتمام کرلیا، جنت میں داخل ہوگا۔ اور پھر یہ آیتیں پڑھ کر سنائیں۔

[جامع الترمذی، سورہ المومنون، حدیث: ۳۰۹۷]

⊙...... ایمان خشوع کو مستلزم اور اس کا متقاضی ہے، اسی لیے دوسری جگہ سورہ الحدید میں فرمایا:

﴿ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ﴾ [الحدید: ۱۶]

''کیا اہل ایمان کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دِل ذکر الٰہی سے اور جو حق اتر چکا ہے، اس سے نرم ہو جائیں۔''

مومنین کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ مقام ایمان سے مقام احسان پر بلند ہوں۔ اور یہ مقام ومرتبہ انہیں اللہ کے اس ذکر میں خشوع ہی کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے، جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں اسلام لائے ہوئے چار سال ہوگئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے (سورہ الحدید کی) ان آیات کے ذریعے ہمیں تنبیہ فرمائی۔

حضرت عبداللہ بن عباس کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے دلوں کو قدرے ڈھیل دیئے رکھی حتی کہ تیرہ سال پورے ہونے پر سورہ المومنون کی آیات ﴿قد افلح المومنون ﷺ الذین هم فی صلاتهم خاشعون ...... ﴾ کے ذریعے تنبیہ فرمائی۔

خشوع کا لغوی معنی ومفہوم:

لغوی اعتبار سے خشوع، جھکاؤ، عاجزی، سکون اور سکینت کو کہتے ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وخشعت الاصوات للرحمن ﴾ [طٰہٰ: ۱۰۸]

''اور سب آوازیں رحمٰن کے سامنے دب کر رہ جائیں گی۔''

زمین کے اوصاف میں بھی ''خشوع'' کا ذکر فرمایا۔ اور اس سے مراد اس کا خشک ہونا، دبا ہوا ہونا اور ایسا ہونا مراد ہے کہ اس میں کوئی انگوری یا نباتات نہ ہو۔ فرمایا:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ﴾ [حم السجدہ: ۳۹]

''اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم زمین کو دبی دبائی دیکھتے ہو، تو جب ہم اس پر پانی نازل کرتے ہیں تو یہ لہلہا اٹھتی اور ابھرنے لگتی ہیں۔''

اور اصطلاحاً بندے کا خشوع یہ ہے کہ انسان اپنے دل میں جھکاؤ، ذلت، عاجزی پائے، اور پوری دلجمعی کے ساتھ اللہ رب العالمین کے سامنے جھک جائے۔

اور یوں بھی کہتے ہیں کہ ''الخشوع: الانقیاد للحق'' (یعنی حق کے

سامنے جھک جانا اور اسے تسلیم کر لینا خشوع کہلاتا ہے۔)
اور یہ کیفیت خشوع کے لازمی نتائج میں سے ہے۔

خشوع کی علامت:

یہ ہے کہ بندے کو جب (اس کی کسی غلطی پر) متنبہ کیا جائے، حق بات بتائی جائے تو وہ اسے فوراً خوشی سے قبول کر لے اور مان لے۔

⦿...... ایک قول اس طرح ہے کہ خشوع اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ خواہشات کی آگ بجھ جائے، سینوں کا دھواں بیٹھ جائے اور دل میں عظمت و تعظیم کا نور چمک اٹھے۔

⦿...... جنید بغدادی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

" الخشوع تذلل القلوب لعلّام الغيوب ـ "

''دلوں کا اپنے علام غیوب کے سامنے اظہار عجز و نیاز اور اقرار ذلت خشوع کہلاتا ہے۔''

⦿...... عارفین کا اجماع ہے کہ خشوع کا مقام و محل دل ہے، اور اس کے اثرات اعضاء و جوارح پر ظاہر ہوتے ہیں۔

⦿...... نبی ﷺ نے کسی کو دیکھا کہ وہ نماز کے دوران میں اپنی داڑھی سے کھیل رہا تھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

" لو خشع قلب هذا لخشعت جوارحهٗ ـ "

''اگر اس کا دل خاشع یعنی متنبہ اور عاجز ہوتا تو اس کے اعضا میں بھی خشوع اور عجز ہوتا۔'' [یہ روایت رسول اللہ ﷺ سے مرفوعاً قطعاً صحیح ثابت نہیں ہے۔ البتہ بعض صحابہ اور تابعین کے اقوال مثلاً سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔]

⦿...... آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک فرمان میں ہے:

''التقویٰ ھھنا'' (تقویٰ تو یہاں ہے۔) اور تین بار اپنے سینے کی طرف اشارہ فرمایا۔ [مسند احمد، حدیث شیخ من بنی سلیط، حدیث: ۲۲۱۲۹]

⦿...... بعض عارفین کا قول ہے:

" حسن آدب الظاهر عنوان ادب الباطن ـ "

''ظاہری حسن ادب، باطنی کیفیت کی نشان دہی کرتا ہے۔''

ایک بزرگ نے کسی کو دیکھا کہ وہ اپنا بدن اور کندھے بہت ہی جھکائے ہوئے تھا، تو انہوں نے اسے سمجھایا کہ میاں! خشوع یہاں ہے ...... اور سینے اور دل کی طرف اشارہ کیا ...... یہاں نہیں ہے ...... اور کندھوں کی طرف اشارہ کیا ......۔

⦿...... صحابہ (میں سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ) کہا کرتے تھے:

" اياكم وخشوع النفاق ـ "

''اپنے آپ کو منافقانہ خشوع سے بچاؤ۔''

ان سے پوچھا گیا کہ منافقانہ خشوع کیا ہوا؟ فرمایا: یہی کہ جسم تو جھکا ہوا دکھائی دے مگر دل میں کوئی عاجزی نہ ہو۔''

⦿...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنی گردن نماز میں (بہت زیادہ) جھکائے ہوئے تھا، تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا:

ارفع رقبتك، ليس الخشوع في الرقاب، انما الخشوع في القلوب ـ "

''اپنی گردن ذرا اونچی رکھا کرو، خشوع گردنوں میں نہیں دلوں میں ہوتا ہے۔''

⦿...... سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کچھ نوجوانوں کو دیکھا کہ ان کی چال میں بڑی نرمی اور کمزوری سی تھی، تو پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ عابد اور ناسک لوگ ہیں۔ فرمایا:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب چلتے تو خوب تیز چلتے تھے، بولتے تو ان کی آواز دبنگ ہوتی تھی، جب (کوئی حد وغیرہ) مارتے تو چوٹ لگاتے تھے، اور جب کھلاتے تو خوب پیٹ بھر کر کھلاتے تھے۔ حقیقی عابد اور ناسک تو وہ لوگ تھے!''

⦿...... جناب فضیل رحمہ اللہ کا قول ہے کہ صحابہ میں یہ بات ناپسند سمجھی جاتی تھی کہ آدمی اپنا خشوع دل کی حقیقی کیفیت سے زیادہ بڑھا کر ظاہر کرے۔

⦿...... سیدنا حذیفہ سے روایت ہے کہ تم لوگ اپنے دین میں سے سب سے پہلے خشوع ہی کو گم پاؤ گے۔ اور پھر سب سے آخر میں نماز بھی جاتی رہے گی۔ کئی نمازی ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں کوئی خیر نہیں، ممکن ہے کہ تم کسی بڑی جماعت والی مسجد میں جاؤ مگر تمہیں ان میں کوئی ایک بھی صاحب خشوع نہ ملے۔

⊙...... جناب سہیل کہتے ہیں: جس کا دل خاشع ہو، شیطان اس کے قریب نہیں آ سکتا۔

خشوع کا ایک لازمی تقاضا اور ادب یہ ہے کہ بندہ جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب کی طرف منہ کیے ہوتا ہے جب کہ وہ ربّ تعالیٰ اوپر کی جانب میں ہے۔ بندہ اسے اپنے سامنے کی طرف سے پکارتا ہے، نہ کہ دائیں بائیں یا نیچے کی طرف سے۔ اور احادیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

لینتهینّ أقوام یرفعون ابصارهم الی السماء فی الصلاة أو لا ترجع الیهم ابصارهم۔" [صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب النهی عن رفع البصر الی السماء فی الصلاة، حدیث: ٦٤٩]

''لوگ اپنی نمازوں کے دوران میں آسمان کی طرف نظریں اٹھانے سے باز آ جائیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی نظریں ہی ان کی طرف واپس نہ آئیں۔''

اور یہ اجمالی مسئلہ ہے کہ نماز کے اندر نمازی کے لیے آسمان کی طرف نظر اٹھانا منع ہے۔☆

⊙...... مسند احمد میں جناب محمد بن سیرین ؒ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ شروع شروع میں نماز کے دوران میں آسمان کی طرف نظر اٹھا لیا کرتے تھے، حتی کہ یہ آیات نازل ہوئیں۔

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴾

تو اس کے بعد آپ کی نظر مقام سجدہ سے آگے نہ بڑھتی تھی۔

اور شریعت کا یہ حکم فطری آداب کے عین مطابق اور ان کی تکمیل کے لیے آیا ہے کہ ایک مانگنے والا، سائل اور دعا کرنے والا جسے کہ خشوع کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے لیے مناسب یہی ہے کہ اس ذات کی طرف نظریں نہ اٹھائے جس سے وہ مانگ رہا ہے۔ بلکہ چاہیے کہ اپنا سر اور نظریں جھکائے رکھے۔

اس فرمان کا یہ معنی بھی نہیں کہ ربّ تعالیٰ آسمانوں سے اوپر عرش پر نہیں ہے، جیسے کہ جاہل جہمیوں کا نظریہ ہے۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے بارے میں اوپر نیچے یا عرش وفرش کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر حقیقت یہی ہوتی جیسے ان لوگوں کا نظریہ ہے تو کسی طرح مناسب نہ تھا کہ اوپر کی طرف تو نظر اٹھانے سے منع کر دیا جائے اور سامنے رکھنے کا حکم دیا جائے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک (اللہ کے بارے میں) دونوں جہتیں برابر ہیں۔ نیز یہ منع نماز کے علاوہ دوسرے حالات میں بھی ہوتی۔ جب کہ نماز کے علاوہ میں آسمان کی طرف دیکھنا منع نہیں ہے۔ جیسے کہ آیات تحویل قبلہ میں ہے:

﴿ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ ﴾ [البقرة: ١٤٤]

''ہم دیکھتے ہیں کہ آپ اپنا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں۔''

تو یہ منع صرف حالت خشوع کے وقت میں ہے...... یعنی دورانِ نماز میں...... اور اسی میں خشوع کا کمال ہے۔ جیسے کہ قیامت کے مناظر میں ہے کہ لوگوں کی حالت یہ ہوگی کہ

﴿ خشعا ابصارهم ﴾ [القمر: ٧]

''اپنی نظریں جھکائے ہوئے ہوں گے۔''

نیز اگر نماز میں آسمان کی طرف نظر اٹھانا اس لیے منع ہوتا کہ ربّ تعالیٰ آسمان پر نہیں ہے تو پھر باقی جہات وجوانب کا بھی یہی حکم ہوتا۔ یا اگر وجہ یہ ہوتی لوگوں کو اس عقیدہ سے منع کیا جائے کہ اللہ آسمان میں ہے یا وہ صرف اپنے دلوں سے اوپر کی طرف متوجہ ہوں تو اس کا واضح اور شافی بیان ہونا چاہیے تھا۔ اور انہیں ایک مستقل ادب کا حکم نہ دیا جاتا کہ اپنے ربّ کے سامنے خشوع کے ساتھ جھک کر کھڑے ہوں، نظریں زمین کی طرف نیچی رکھیں۔ جیسے کہ بادشاہوں کے سامنے کیا جاتا ہے۔ بہرحال ان دلائل میں جہمیہ کے عقیدہ کی تردید ہے۔

⊙...... صحیح احادیث اس مسئلہ خشوع کی تفسیر وتوضیح اس طرح کرتی ہیں:

" إذا قام أحدكم إلى الصلاة فإنما يستقبل ربّه ۔"

[سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة، کراهیة البزاق فی المسجد، حدیث: ٤٠٦]

☆ بعض بزرگوں نے اس کی علت یہ بتائی ہے کہ نماز کے دوران میں نازل ہونے والے انوار کا تحمل انسان کے لیے بہت مشکل ہے۔ واللہ اعلم (نیل الاوطار، ج:۲، ص:۲۱۰ بحوالہ جامع حماد بن سلمہ) اور اس کی دلیل سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کی روایت بتائی ہے۔

''جب تم میں سے کوئی نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے ربّ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔''

⊙......اور فرمایا:

" فاللّٰه يقبل عليه بوجهه ما لم يصرف وجهه عنه۔"

''اللہ تعالیٰ بندے کی طرف اپنا چہرہ کیے رہتا ہے جب تک کہ بندہ اس کی طرف سے اپنا چہرہ نہ پھیر لے۔''

⊙......اور فرمایا:

" إذا قام أحدكم الى الصلاة فلا يبصقن قبل وجهه ۔" [النسائی، المساجد، حديث: ٧١٦ معناه]

''جب تم میں سے کوئی نماز کے لیے کھڑا ہو تو اپنے چہرے کے سامنے ہرگز نہ تھوکے۔''

⊙......اور فرمایا:

" فإن اللّٰه بينه وبين القبلة ۔" [بخاری، كتاب الصلاة، اذا بدره البزاق، حديث: ٤٠٠ بلفظ ربه]

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ بندے اور قبلے کے درمیان ہوتا ہے۔''

⊙......اور فرمایا:

" إن اللّٰه يأمركم بالصلاة فإذا صليتم فلا تلتفتوا فإن اللّٰه ينصب وجهه لوجه عبده فى صلاته مالم يلتفت ۔ " [صحيح ابن حبان، ترمذی، جامع ترمذی، الامثال عن رسول الله ﷺ، حديث: ٢٧٩٠]

''اللہ نے تمہیں نماز کا حکم دیا ہے۔ تو جب نماز پڑھو تو ادھر ادھر مت جھانکا کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نماز کے دوران میں اپنا چہرہ بندے کی طرف کیے رہتا ہے جب تک کہ بندہ ہی ادھر ادھر نہ جھانکنے لگے۔''

⊙......اور فرمایا:

" إنّ العبد اذا توضّأ فأحسن الوضوء ثم قام الى الصلاة أقبل اللّٰه عليه بوجهه فإذا التفت اعرض اللّٰه عنه، وقال يا ابن آدم! أنا خير ممن تلتفت إليه۔ فإذا أقبل على صلاته أقبل اللّٰه عليه فإذا التفت اعرض اللّٰه عنه ۔"

''بندہ جب وضو کرتا ہے اور عمدہ وضو کرتا ہے، پھر نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے چہرے کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، تو اگر بندہ اس سے التفات کرلے (ادھر ادھر جھانکے دیکھے) تو اللہ اس سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اور کہتا ہے: اے ابن آدم! تو جس کی طرف متوجہ ہو رہا ہے، میں اس سے بہت بہتر ہوں۔ پھر جب وہ اپنی نماز کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ اس سے التفات کرتا اور منہ پھیر لیتا ہے تو اللہ بھی اس سے اعراض کرلیتا ہے۔''

⊙......حضرت عبداللہ بن عمر نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ

" إذا صلّى أحدكم فلا يتخمّمنّ تجاء وجه الرحمن ۔"

''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے لگے تو رحمٰن کے چہرے کی طرف ہرگز نہ تھوکے۔''

⊙......سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا:

إن العبد إذا قام إلى الصلاة فإنه بين عينى الرحمن، فإذا التفت قال له: ابن آدم! إلٰى من تلتفت؟ إلٰى خير لك منى تلتفت ؟ " [أخرجه العقيلى فى الضعفاء: ١/ ٧٠، ٧١، واسناده تالف]

''بندہ جب نماز پڑھنے لگتا ہے تو ہو رحمٰن کی دو آنکھوں کے درمیان ہوتا ہے۔ تو اگر وہ ادھر ادھر جھانکے تو اللہ فرماتا ہے: اے ابن آدم! تو کس کی طرف دیکھتا ہے؟ کیا کوئی تیرے لیے مجھ سے بہتر ہے کہ تو اس کی طرف جھانکتا ہے؟''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ بے خشوع نماز کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ کیا یہ شمار ہوتی ہے یا نہیں؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اجر وثواب کے پہلو سے اس کا کوئی شمار نہیں، سوائے اس کے جو بندے نے سوچ سمجھ کر اور دھیان سے پڑھی

ہو۔اور اپنے کے سامنے جس قدر خشوع کیا ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

ليس لك من صلاتك الا ما عقلت منها ـ

”تمہاری نماز تو بس وہی ہے جو تم نے دھیان سے سوچ سمجھ کر پڑھی ہو“

مسند احمد میں مرفوع حدیث ہے:

إنّ العبد ليصلّى الصلاة ولم يكتب لهٗ الّا نصفها، أو ثلثها، أو ربعها ...... حتى بلغ عشرها ـ [احمد: ٤/ ٣١٦، ابوداؤد، كتاب الصلاة، باب ما جاء فى نقصان الصلاة، حديث: ٧٩٦]

”بندہ نماز پڑھتا ہے مگر اس کے لیے اس میں سے صرف آدھی نماز لکھی جاتی ہے یا تہائی یا چوتھائی......حتی کہ دسویں حصے تک کا ذکر فرمایا۔“

اور اللہ تعالیٰ نے بھی نمازیوں کی فلاح کو ان کی نمازوں میں خشوع کے ساتھ معلق فرمایا اور ان کے اجر کو اسی پر مرتب فرمایا ہے۔تو اس کا لازمی معنی ومفہوم یہ ہے کہ جو شخص نماز میں خشوع نہیں کرتا وہ اہل فلاح (اور کامیاب) لوگوں میں سے بھی نہیں ہے۔اگر بے خشوع نماز کا کوئی ثواب ہوتا تو ایسا آدمی ضرور مفلحین اور کامیاب لوگوں میں شمار ہوتا۔

البتہ دنیاوی احکام کے لحاظ سے (ایسے شخص کو بے نماز نہیں کہا جائے گا) اس کے ذمے اس کی قضا نہیں ہوگی۔ہاں اگر اس کی نماز میں خشوع کی کیفیت غالب ہو۔سوچ سمجھ کر پڑھی ہو تو وہ شمار ہوتی ہے،اور اس پر علماء کا اجماع ہے۔اور پھر فرضوں سے پہلے اور بعد کی سنتیں اور دیگر اذکار اس کے نقص کو پورا کرنے والے بن جاتے ہیں۔لیکن اگر عدم خشوع کی کیفیت غالب ہو کہ بندہ نماز میں بے خبر رہا ہو تو اس کی نماز کے اعادے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔

علماء حنابلہ میں سے ابوعبداللہ بن حامد اور ابوحامد غزالی نے احیاء علوم الدین میں ایسی نماز کے اعادہ کو واجب کہا ہے۔

بے خشوع نماز کے دہرانے کے دلائل:

⊙...... بے خشوع کی نماز کا کوئی ثواب نہیں، نہ ایسے آدمی کے لیے فلاح کی ضمانت ہے، نہ اس سے ذمہ داری ادا ہوتی ہے۔اس کے باوجود قضا دینی واجب نہیں ہے، قضا دینا اس سے ساقط ہے جیسے کہ کسی ریاکار کی نماز کا حال ہوسکتا ہے۔

⊙...... یہ حضرات کہتے ہیں کہ نماز کو خشوع، دھیان اور توجہ سے ادا کرنا نماز کی روح ہے، نماز کا مقصود اصل ہے اور یہی چیز اخلاص ہے۔تو جس کی نماز میں اس کی اصل روح ہی نہ ہو تو اسے کس طرح شمار کیا جاسکتا ہے۔ہاں ظاہری شکل وصورت ضرور قائم ہے۔

⊙......ان حضرات کا استدلال اس طرح سے بھی ہے اگر کوئی نماز میں سے جان بوجھ کر کوئی واجب عمل چھوڑ دے تو اس کی نماز باطل ہوجائے گی۔اسے اس مثال سے سمجھئے کہ اگر کسی کے ذمے کفارہ میں ایک غلام آزاد کرنا ہو اور پھر وہ کوئی ایسا غلام آزاد کردے جس کا کوئی نمایاں عضو مفقود ہو (تو اس کا کفارہ ادا نہیں ہوگا)۔تو یہی کیفیت نماز کی ہے۔تو گویا وہ غلام کی طرح ہوئی مگر مردہ۔جب کسی فالج زدہ غلام کو کفارہ میں کامل غلام قرار نہیں دے سکتے اور قبول نہیں کرتے تو مردہ غلام کو کیوں کر قبول کیا جاسکتا ہے۔

⊙......سلف میں سے بعض نے اس کی یوں تفہیم کی ہے کہ نماز گویا ایک لونڈی ہے جو کسی بادشاہ کو ہدیہ کی جارہی ہے۔تو کیا خیال ہے کہ اگر کوئی فالج زدہ، لولی لنگڑی، اندھی، کانی، بیمار، بدشکل اور قبیح لونڈی ہدیہ کرے تو کیا قبول ہوجائے گی؟ یا اس سے بھی بڑھ کر اگر کوئی مردہ لونڈی پیش کردے؟ ظاہر ہے کہ یہ ہدیہ کسی صورت ہدیہ نہ ہوگا اور نہ قبول ہوگا!

تو نماز کے بارے میں غور کیا جائے کہ بندہ اپنا یہ عمل اللہ ربّ العالمین کے حضور پیش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو انتہائی جمیل ہے اور جمال ہی کو پسند فرماتا ہے۔اور عمدہ چیزیں ہی قبول فرماتا ہے اور ایسی نماز جس میں روح ہی نہ ہو کسی صورت عمل طیب نہیں کہلاسکتی، جیسے کہ کفارہ میں آزاد کرنے کے لیے بے روح غلام عتق طیب نہیں ہوسکتا!

⊙......ان حضرات کا اسلوب تفہیم اس طرح بھی ہے کہ دل جو تمام اعضاء وجوارح کا سردار اور بادشاہ ہے اسے عبادت میں حضوری وخشوع سے معطل رکھنا اسے اس کی عبودیت اور عبادت سے معطل رکھنا ہے تو ایسی صورت میں دیگر اعضاء کی طاقت وعبودیت دل کی کفایت نہیں

کرسکتی، جب کہ دل ان سب کا سردار اور بادشاہ ہے، اور تمام اعضا دل ہی کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر دل درست ہوتو باقی اعضاء بھی درست ہوں گے اور اگر دل خراب ہوتو باقی اعضاء بھی خراب ہوں گے۔ اگر دل اپنی عبودیت پیش نہ کررہا ہوتو دیگر اعضاء کی عبودیت بالا ولیٰ معتبر نہ ہوگی۔ اگر دل کی عبادت اور عبودیت خراب ہو، نماز کے دوران میں غفلت اور وساوس کا شکار ہے تو اس کی رعیت کی عبودیت کس طرح صحیح ہوسکتی ہے۔ جب کہ وہ اسی کے حکم کے تحت کام کرتے اور اعمال بجا لاتے ہیں۔

⦿......جامع ترمذی کی یہ روایت کہ

" إن اللّٰه لا يستجيب الدعا من قلبٍ غافلٍ ۔"

[جامع الترمذی، کتاب الدعوات، حدیث: ۳۴۰۱]

''اللہ تعالیٰ کسی غافل دل کی دعا قبول نہیں فرماتا۔''

یہ حقیقت یا تو خاص دعا عبادت سے متعلق ہے یا عمومی دعاؤں سے۔ (جو معروف عبادت میں نہیں ہوتیں) یا دعا سوال سے متعلق ہوسکتی ہے۔ (بہر حال اس کا تعلق خواہ کسی سے ہو) جب سوال وطلب کی دعا میں غفلت کی دعا قبول نہیں ہوتی تو دعا عبادت میں جو......(اخلاص اور توجہ) اس کا خاص حق ہے......اس کے بغیر وہ کیسے قبول ہوگی؟

بندے کی ایسی عبادت جس میں اس پر غفلت غالب ہو اور وہ بھول بھلیوں میں کھویا رہے۔ تو اس میں بالعموم اخلاص بھی نہیں ہوتا ہے۔ اخلاص میں الٰہ الحق کی عبادت مقصود ومطلوب ہوتی ہے اور غافل کا تو کوئی ارادہ یا مقصود ہی نہیں ہوتا۔ تو وہ اس کی عبادت بھی نہ ہوئی۔

⦿......سورہ الماعون میں جو ﴿ فويل للمصلين ٥ الذين هم عن صلاتهم ساهون ﴾ آیا ہے ''کہ ہلاکت ہے ان نمازوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غافل رہتے ہیں۔)'' یہاں ان لوگوں کے سہو اور بھولنے سے مراد ان کا نماز چھوڑنا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ نماز کے تارک ہوں تو انہیں ''مصلین'' (نمازی) نہ کہا جاتا۔ بلکہ یہاں اس کے واجبات میں سہو اور غفلت سے مراد ہے، مثلاً

i...... یا تو اس سے مراد وقت کی غفلت ہے کہ وہ اس کی ادائیگی کے لے وقت سے غافل رہتے ہیں اور بے وقت کرکے پڑھتے ہیں۔ جیسے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

ii......یا اس میں استحضار، حضوریٔ قلب اور خشوع سے غفلت مراد ہے۔

اور صحیح بات یہ ہے کہ اس سہو اور غفلت میں یہ دونوں ہی باتیں ہیں۔ کیوں کہ اللہ عزوجل نے ان کے لیے صلاۃ کا اثبات فرماتے ہوئے انہیں ''مصلین'' بتایا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ وہ اس میں غفلت کا شکار رہتے ہیں۔ تو یہ سہو یا تو صحیح مطلوب شرعی وقت سے غفلت مراد ہے یا عدم اخلاص اور حضوریٔ قلب کا فقدان، جو نماز کے واجبات میں سے ہے۔

الغرض اگر اس سہو میں کسی واجب سے غفلت مراد ہو تو اس میں بہت بڑی دھمکی اور وعید ہے کہ اس پر ﴿ ويل للمصلين ﴾ کہا گیا ہے تب یہ وعید عدم اخلاص اور حضوریٔ قلب کے فقدان پر بطریق اولیٰ ثابت آتی ہے کیوں کہ

⦿......وقت کی پابندی کسی شرعی عذر کی بنا پر ساقط ہوجاتی ہے۔ اور عذر کی صورت میں نماز دوسرے وقت میں ادا کرنا مشروع کیا گیا ہے۔ مگر اخلاص اور حضوریٔ قلب تو ایک ایسی کیفیت ہے جو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتے اور نہ ان کا کوئی بدل ہے۔

⦿...... نیز وقت کا وجوب اسی لیے ساقط کیا گیا ہے کہ صاحب عذر کو دوسرے وقت میں حضوریٔ قلب کی مصلحت حاصل رہے اسی غرض سے جمع بین الصلوٰتین کو مباح کیا گیا ہے، تاکہ نماز بے دل اور بے حضوری والی نماز نہ رہے جیسے کہ مسافر ہوتے ہیں، یا مریض اور دیگر اعذار والے لوگ۔ جیسے کہ امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کا قول ہے۔

الغرض اخلاص، حضور قلب اور توجہ الی اللہ کا عمل نماز کے دوران میں شارع علیہ السلام کی نظروں میں دیگر تمام مصالح سے بڑھ کر ہے۔ تو کیا خیال ہے کہ

حضرات فقہائے کرام عمداً ایک تکبیر کے چھوڑ دینے، اعتدال نہ کرنے، کوئی حرف بلکہ مد ترک کردینے، تسبیح نہ پڑھنے، یا سمع اللہ لمن حمدہ یا ربنا ولک الحمد نہ کہنے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آنے پر صلوٰۃ وسلام پڑھ دینے سے تو نماز کو باطل فرمائیں......مگر اس عظیم ترین عبادت کی اصل روح خلاصہ اور مغز (یعنی اخلاص اور حضور قلب) کے فوت ہونے

سے اسے صحیح کہیں (بڑے تعجب کی بات ہے!) اور اس طائفہ کے یہ دلائل جیسے کہ آپ نے دیکھا بڑے قوی ہیں!

⊙...... دوسرے گروہ کے دلائل (کہ غفلت کی نماز دہرانے کی ضرورت نہیں) یہ حضرات کہتے ہیں کہ نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ

" إذا أذّن المؤذن أدبر الشيطان، ولهٗ ضراط حتى لا يسمع التاذين، فإذا قضى التاذين أقبل، فإذا ثوّب بالصلاة أدبر۔ فإذا قضى التثويب أقبل حتى يخطر بين المرء وبين نفسه، فيذكره مالم يكن يذكر، ويقول: اذكر كذا اذكر كذا لما لم يكن يذكر، حتى يظل الرجل لا يدري كم صلّى، فاذا وجد ذلك أحدكم فليسجد سجدتين وهو جالس۔"

''جب موذن اذان کہتا ہے تو شیطان پیٹھ دے کر گوز مارتا ہوا بھاگ نکلتا ہے حتی کہ اذان نہیں سن پاتا۔ جب اذان مکمل ہوجاتی ہے تو لوٹ آتا ہے۔ پھر جب اقامت ہوتی ہے تو پیٹھ دے جاتا ہے، جب اقامت مکمل ہوجاتی ہے تو پھر آجاتا ہے اور نمازی بندے کے دل میں وسوسے ڈالنے لگتا ہے، اور اسے وہ کچھ یاد کراتا ہے جو اسے عام حالات میں یاد نہیں ہوتا، فلاں بات یاد کرو، فلاں بات یاد کرو جو اسے یاد نہیں ہوتیں حتی کہ آدمی اس حالت میں پہنچ جاتا ہے کہ اسے خبر ہی نہیں رہتی کہ وہ کس قدر نماز پڑھ چکا ہے۔ تو جب کوئی ایسی صورت حال سے دوچار ہو تو اسے چاہیے کہ (نماز کے آخر میں) جب وہ بیٹھا ہوا ہو تو دو سجدے کرلیا کرے۔''

⊙......ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ ایسی نماز جس میں شیطان نے اسے سہو یا غفلت میں مبتلا کردیا ہو اور اسے اپنی گنتی وغیرہ یاد نہ رہے تو وہ دو سجدے کرلے۔ آپ علیہ السلام نے اسے نماز دہرانے کا حکم نہیں دیا۔ اگر اس کی نماز سرے سے باطل ہوتی تو آپ اسے اعادے کا حکم دیتے!

⊙......سجود سہو کی یہی حکمت ہے کہ جب بندے کو شیطان نے غافل کردیا تو پھر وہ مزید دو سجدے کرے تاکہ اس کی ناک خاک آلود ہو۔ اور آپ نے ان سجدوں کو ''مرغمتین'' فرمایا ہے (یعنی خاک آلود کرنے والے) اور یہ تلقین ہر اس شخص کو ہے جو نماز میں کسی طرح غافل ہوجائے۔ اور اس میں کوئی تفصیل نہیں کہ وہ سہو تھوڑا ہو یا زیادہ، غالب ہو یا مغلوب، بلکہ فرمایا: لكل سهو سجدتان ''ہر سہو کے لیے دو سجدے ہیں۔'' اس میں کسی غالب ومغلوب سہو کا استثناء نہیں ہے۔

⊙...... یہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ شریعت کے احکام افعال ظاہرہ سے متعلق ہیں، البتہ باطنی حقائق ایمانیہ کا تعلق ثواب وعتاب کے ساتھ ہے اور احکام الٰہیہ کے دو پہلو ہیں۔ دنیا کا حکم احکام ظاہرہ اور اعمال جوارح کے ساتھ ہے۔ اور احکام آخرت ظاہر اور باطن دونوں کے ساتھ متعلق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ منافقین کے ظاہری اعمال قبول فرماتے تھے اور ان کے باطنی اعمال کو اللہ کے سپرد کرتے تھے۔ اسی بنیاد پر ان سے نکاح ہوتے، وہ لوگ وارث بنتے اور بنائے جاتے تھے۔ دنیاوی احکام کے مطابق ان کی نمازیں شمار ہوتی تھیں اور انہیں تارک صلاۃ نہیں سمجھا جاتا تھا کیوں کہ وہ لوگ نماز کی ظاہری شکل وصورت پیش کردیتے تھے۔

اور ثواب وعتاب کا معاملہ کسی انسان اور بشر کے ساتھ نہیں ہے، وہ سراسر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، اور آخرت میں وہی اس کا والی ہے۔

یہ حضرات کہتے ہیں کہ جب ہم نے شریعت اسلام کی رو سے کسی منافق اور ریاکار کی نماز کو صحیح کہا ہے اگرچہ عتاب اس سے ساقط نہیں ہے، اور آخرت میں اسے ثواب نہیں ملے گا۔ تو ایک مسلمان کی نماز ......جس میں وہ غفلت یا وسوسے کا شکار ہوجاتا ہے اور دل کی بے حضوری کے باعث وہ درجہ کمال تک نہیں پہنچ پاتی ہے......تو بالاولیٰ صحیح ہونی چاہیے۔

ہاں! یہ ضرور ہے کہ ایسی نماز کا ثواب نہیں ہوتا نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ ☆

☆ دنیا کا فائدہ یعنی ......اللہ تعالیٰ کا ذکر......ایمان کی نورانیت اور اس میں اضافہ، فواحش ومنکرات سے تحفظ وغیرہ جیسے کہ آگے کی سطروں میں بیان آرہا ہے۔ (راقم سعیدی عرض کرتا ہے کہ) نماز بحیثیت نماز جیسی کیسی بھی ہو دنیا میں فائدہ ضرور دیتی ہے۔ ایمان واخلاص کے فرائض کو زیادہ نہیں تو کم ازکم ان دس پندرہ منٹوں کے لیے تو فحشاء ومنکر سے باز رکھتی ہی ہے جس میں وہ اس عمل میں مشغول رہتا ہے۔ اگر توفیق شامل حال ہو تو یہ عمل بھی دھیرے دھیرے اس کے زنگ کو اتارنے کا باعث بن سکتا ہے اور عین ممکن ہے کہ اخلاص کی نعمت سے بھی وہ کسی وقت متمتع ہو ہی جائے۔ واللہ اعلم

اور نماز کا فوری اثر اور ثواب یقیناً ہے۔ یعنی دل کو ایمانی قوت نصیب ہوتی ہے۔ دل منور اور اس میں انشراح اور کشادگی آتی ہے۔ عبادت میں حلاوت ولذت حاصل ہوتی ہے اور عمومی طور پر بھی بندہ فرحت وسرور سے شادمان ہوتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف توجہ سے حاصل ہونے والی لذت، اس کے ساتھ مناجات کا سرور اور کیف ایک ایسی نعمت ہے کہ اس کا کوئی بدل نہیں۔

جیسے کہ دنیا میں مشاہدہ ہے کہ اگر کسی شخص کو کسی بڑے منصب دار یا بادشاہ وغیرہ کے ساتھ قربت کا کوئی موقع مل جائے تو وہ اپنے آپ میں مسرت سے پھولے نہیں سماتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کا قرب تو کہیں افضل واعلیٰ اور برتر ہے۔ اور آخرت کے درجات اور وہاں مقربین کی صحبت ورفاقت ان کے علاوہ ہیں۔

یہ سب فضائل اور انعامات عبادت میں حضوریٔ قلب اور خشوع وخضوع کے فقدان سے مفقود ہوجاتے ہیں۔ اور دو آدمی ایک ہی صف میں ساتھ ساتھ کھڑے نماز پڑھتے ہیں مگر ان دونوں کی نمازوں میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔

بہرحال اگر یہ کہا جائے کہ ان ثمرات وفوائد کے حصول کے لیے بے خشوع اور بے دلی کی نماز کا اعادہ واجب کیا جائے تو یہ اس شخص کی اپنی خوشی پر منحصر ہے، خواہ حاصل کرلے یا ضائع کردے۔ مگر ہم اس پر کسی طرح لازم نہیں ٹھہرا سکتے۔ اس پر کوئی عتاب دین یا اس پر تارک صلاۃ کے احکام لگائیں۔ تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اور یہی قول راجح ہے۔

خشوع وخضوع اور اخلاص بھری نماز کا اہتمام کرنے والے سعادت مندوں کے بارے میں خوشخبری دی گئی ہے کہ

﴿ **اولـئك هم الوارثون o الـذيـن يرثون الفردوس هم فيها خالدون** ﴾ [المومنون: ۱۰، ۱۱]

''یہی ہیں جو وارث ہوں گے...... فردوس کے...... اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔'' اور فرمایا:

﴿ **ان الذين آمنوا وعملوا الصالحات كانت لهم جنات الفردوس نزلا o خالدين فيها لا يبغون عنها حولا** ﴾

[الکھف، ۱۰۷، ۱۰۸]

''بلاشبہ جو ایمان لائے اور کام بھی اچھے کیے یقیناً ان کے لیے الفردوس کے باغات کی مہمانی ہے۔ جہاں وہ ہمیشہ رہا کریں گے، جس جگہ کو بدلنے کا انہیں کبھی بھی خیال نہیں آئے گا۔''

''فردوس'' کا لفظ تمام ہی جنتوں کے لیے بولا گیا ہے۔ یا افضل واعلیٰ مقام والی جنت کو فردوس کہتے ہیں۔ اس کلمہ کا اصل معنی ومفہوم عربی میں بستان اور فارسی میں بوستان ہے (جسے ہم اردو میں شان دار باغ کہتے ہیں۔)

کعب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ الفردوس وہ باغ ہوتا ہے جس میں انگور ہوں۔ لیث کا بھی یہی قول ہے۔

مبرد کہتے ہیں۔ فردوس وہ باغ ہوتا ہے جس میں درختوں کا جمگھٹا ہو مگر انگور غالب ہوں۔

مجاہد کہتے ہیں کہ فردوس، رومی زبان میں باغ وبستان کو کہتے ہیں۔ زجاج کہتے ہیں کہ یہ لفظ اصلاً رومی زبان کا لفظ ہے جو عربی میں نقل ہوا ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ باغ جس میں ہر طرح کے پھول اور پھل جمع ہوں ''الفردوس'' کہلاتا ہے۔

سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کا شعر ہے:

إن ثـواب الـلّٰـه كـل مـخـلـد
جـنـان مـن الـفـردوس فيهـا يـخلد

''اللہ کا اجر وثواب ہمیشہ ہمیش کا ہے اور (بندہ) فردوس کے باغات میں ہمیشہ تک کے لیے رہے گا۔''

انتهى ما أفاد الشيخ رحمه اللّٰه تعالىٰ

راقم مترجم عرض کرتا ہے کہ

نماز میں خیالات ووساوس کی آمد ورفت ایک فطری اور غیر اختیاری معاملہ ہے۔ مگر ایک فکر مند صاحب ایمان کے لیے ان پر کسی حد تک کنٹرول کرلینا بھی ممکن ہے۔ جس کی حقیقی اساس

⦿ ...... اللہ عزوجل کی عظمت وجلال کا تصور

⊙......اس الرحمٰن الرحیم کی محبت اور تقرب

⊙...... جنت الفردوس کے بے مثل انعامات کا شوق

⊙......اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور میزان عدل میں ناکامی کا خوف

⊙...... پل صراط کی مشکلات

⊙...... رسول اللہ ﷺ کا قرب آپ کی شفاعت اور لواء الحمد تلے کچھ جگہ حاصل ہونے کی امید

⊙......اور جنت الخلد میں صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت کی تمنا ہو سکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرت، صحابہ کرام، تابعین عظام اور دیگر ائمہ صالحین کے واقعات بندے کو اس مقام عالی کے حصول کے لیے ایک بڑ مہمیز دیتے ہیں۔

خیالات و وساوس کے مسئلہ کو برادر مکرم فضیلۃ الشیخ مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ نے اپنی کتاب ''فلاح کی راہیں'' میں بڑی خوبی و عمدگی سے بیان فرمایا ہے۔ ہم اپنے قارئین کو اس مبارک کتاب کے مطالعہ کی بھرپور سفارش کریں گے، فرماتے ہیں:

''یاد رہے کہ وساوس کا آنا اور وسوسہ لانا دونوں میں بڑا فرق ہے، وسوسہ آنا غیر اختیاری ہے، انسان اس میں مجبور ہے اسے چاہیے کہ جب وسوسہ آئے تو اس کے پیچھے نہ لگ جائے۔ بلکہ اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر اپنی نماز کی طرف توجہ کرے۔ انسان کے دل کی مثال جرنیلی سڑک کی ہے جس پر ہر قسم کی ٹریفک رواں دواں ہے۔ پیدل چلنے والے بھی، سائیکل، موٹر سائیکل والے بھی، کار اور ہیوی ٹریفک والے بھی آ جا رہے ہیں ایک سمجھ دار، عقل منداور ہوشیار انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا سفر جاری رکھے اپنی سمت سیدھی رکھے، جو گاڑیاں آ جا رہی ہیں ان کے بارے میں غور و تامل نہ کرے، نظر ان پر پڑے تو وہ اسے دیکھتا ہی نہ رہ جائے، بس آئی اور گئی ورنہ خطرہ ہے کہ ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔ بالکل اس طرح دل میں وسوسہ آئے تو اس کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے۔ فوراً اس سے توجہ ہٹا کر نماز کی طرف توجہ کر لینی چاہیے۔ اور اسے اپنا سفر جاری و ساری رکھنا چاہیے، راہ چلتے ہوئے کسی رکاوٹ پر رک جانا یا راستہ روکنے والے سے الجھنا منزل مراد پر پہنچنے سے روک دے گا۔

وسوسہ ڈالنے والے شیطان کا نام اور اس کا علاج:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن ابی العاص سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! شیطان میرے اور میری نماز میں میری قراءت کے مابین حائل ہو جاتا ہے، اور قراءت کو مشتبہ کر دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

" ذاك شيطان يقال له خنزب فاذا احسسته فتعوذ بالله منه واتفل على يسارك ثلاثا قال ففعلت ذلك فاذهب الله عنى ۔" [مسلم، ص:۲۲۴، ج:۲]

وہ شیطان ہے اسے خنزب کہا جاتا ہے، جب تمہیں اس کا احساس ہو اس سے اللہ کی پناہ طلب کرو اور اپنے بائیں طرف (یعنی دل کی جانب) تین بار تھوک دو، یعنی دم کی صورت میں تین بار دل پر پھونک مارلو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے ایسا ہی کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے مجھ سے دور کر دیا۔ لہٰذا وسوسہ کی صورت میں چاہیے کہ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھ کر تین بار دل کی جانب پھونک مار لے۔

امام ابراہیم بن عبدالواحد مقدسی رحمہ اللہ جو حافظ عبدالغنی رحمہ اللہ مقدسی کے بھائی تھے، بڑے عابد و زاہد اور متقی انسان تھے، کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہم نے کبھی بھی انہیں اللہ کی نافرمانی کرتے نہیں دیکھا، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو ابتدا ہی میں تکبیر تحریمہ سے پہلے تعوذ پڑھ کر تین بار دل پر دم کر لیا کرتے۔

[ذیل طبقات حنابلہ لابن رجب، ج:۲، ص:۹۸]

اللہ پرستی نہ کہ لذت پرستی:

نماز میں اطمینان نصیب ہو، دل جمعی پیدا ہو، لذت و لطف حاصل ہو تو ایسی نماز ہی آنکھ کی ٹھنڈک، دل کا نور اور روح کے سرور کا باعث ہے۔ لیکن اگر لذت نہ آئے تو اس سے قطعاً دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ نماز اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر پڑھنی چاہیے، لذت آئے یا نہ آئے، لذت کے لیے نماز پڑھنا، لذت نہ آئے تو نماز چھوڑ دینا، یہ تو لذت پرستی ہوئی، اللہ پرستی نہ ہوئی، اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے نماز پڑھنی

چاہیے لذت اور لطف کے لیے نہیں۔

یاد رہے کہ جس طرح شیطان انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے، اسی طرح انسان کا اپنا نفس بھی وسوسہ میں مبتلا کرتا ہے اور اس کا سبب انسان کے کسب اور اختیار سے ہے۔ چناں چہ اس کا دل جس قدر شہوات اور دنیاوی لذات کی محبت میں گرفتار ہوگا، اسی قدر وہ وساوس میں زیادہ مبتلا ہوگا۔ جب دل کہیں اور اٹکا ہوا ہو، منکرات وفواحش میں گرفتار ہو، تو نماز میں دل خاک لگے گا، دل ان خرافات سے جس قدر فارغ ہوگا نماز میں اسی قدر زیادہ دل لگے گا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فرشتہ رحمت اس گھر میں نہیں آتا جس میں تصویریں آویزاں ہوں تو بھلا اس دل میں اللہ اپنی محبت کس طرح ڈالے گا جو صنم خانہ بنا ہوا ہو۔ [الفتح الربانی]

تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اور حدیث پاک میں جو "شر نفس" سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے اس شر کی ایک صورت دنیاوی شہوات سے محبت ہے، جس میں گرفتار ہو کر انسان اپنے محبوب حقیقی سے دور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے وساوس ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا حصول یا اس پر قدرت تو نماز سے فارغ ہو کر ہی ہوگی۔ لہٰذا ان کے بارے میں وسوسہ کا کیا فائدہ؟ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ربّ ذوالجلال والاکرام کے سامنے کھڑے ہو کر دنیائے مردار وغدار کے پیچھے پڑا ہوا ہوں، اس سے بڑی بے مروتی اور کیا ہوگی، یوں ان وساوس کے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اپنی توجہ نماز کی طرف مبذول کرنی چاہیے، یہ وسوسہ ایک بار نہیں بلکہ بار بار آئے گا، کہ وسوسہ میں تکرار کے معنی پائے جاتے ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے، کہ "وسوسہ یا شیطان کی حیثیت چور یا ڈاکو کی ہے، مسافر منزل مقصود تک جانا چاہتا ہے مگر چور راستہ روک لیتا ہے، اسی طرح بندہ مومن سیر الی اللہ میں مصروف ہوتا ہے اور نماز میں اپنے محبوب کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے مگر شیطان اس کا راستہ روک لیتا ہے"، اس کی توجہ اس کے محبوب سے پھیر دیتا ہے، بندہ مومن کو چاہیے کہ وہ اپنا سفر جاری رکھے اور شیطان سے الجھنے کی کوشش نہ کرے۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق تعوذ کے ذریعہ شیطان سے پناہ مانگے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا ﴾ [العنکبوت: ٦٩]

"جو ہمارے بارے میں کوشش کرتے ہیں، ہم ان کو اپنی راہ کی ہدایت عطا کرتے ہیں۔"

لہٰذا پیچھے پڑنے کی بجائے اس کے ازالہ کی کوشش کرنی چاہیے، جو کوشش کرتا ہے وہ منزل مراد پالیتا ہے، مقابلہ ومرحلہ بلاشبہ بڑا کٹھن ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے مکمل نہ سہی کچھ نہ کچھ حصہ تو ضرور ان شاء اللہ مل ہی جائے گا۔

"انا عند ظن عبدی بی۔"

[فلاح کی راہیں، ص:۳٦-۳۹]



سالانہ تقریب بخاری شریف

①...... جامعہ محمدیہ اہل حدیث خان پور ضلع رحیم یار خان کی سالانہ تقریب بخاری شریف ۲۵۔ جولائی ۲۰۰۹ء بروز ہفتہ بعد نماز مغرب ہوگی۔

صدارت: حافظ ڈاکٹر عبدالکریم صاحب۔ مہمان خصوصی: الشیخ محمد شریف چنگوانی صاحب، حافظ محمد سلفی صاحب، صوفی عائش محمد صاحب، مولانا محمد یونس بٹ صاحب۔ درس بخاری شریف: مولانا حافظ ڈاکٹر عبدالرشید اظہر صاحب ارشاد فرمائیں گے۔ بعدازاں جلسہ سے مولانا منظور احمد، مولانا یاسین بلوچ ودیگر علماء خطاب کریں گے۔

[جامعہ محمدیہ اہل حدیث خانپور، رحیم یار خان]

②...... جامعہ اہل حدیث چوک دالگراں لاہور کے زیر اہتمام تقریب بخاری شریف وسالانہ اہل حدیث کانفرنس ۲۴۔ جولائی ۲۰۰۹ء بروز جمعرات گئے تک ہوگی۔ خطبہ جمعۃ المبارک قاری عبدالرحیم کلیم ارشاد فرمائیں گے۔ بعد نماز عصر بخاری شریف کی آخری حدیث پر شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب درس ارشاد فرمائیں گے۔ بعد نماز عشاء جلسہ ہوگا۔ میاں عبدالمجید ملتان، قاری عبدالحفیظ فیصل آبادی، حافظ عبدالوحید روپڑی، سید سبطین شاہ نقوی، قاری خالد مجاہد، مولانا منظور احمد گوجراں والا۔

شہادت طور، منیجر تنظیم اہل حدیث، لاہور

فون: 0300-4583187

معاشی مسائل

سرمایہ دارانہ نظام اور اسلام

پروفیسر عبدالعظیم جانباز، سیالکوٹ

سرمایہ داری نظام اسلامی دنیا کی نہیں، یورپ کی پیداوار ہے۔ یہ مشین کی آمد کا نتیجہ تھا جو یورپ میں اتفاق سے ایجاد ہوئی اور وہیں سے دنیا کے باقی حصوں میں پھیلی۔ دنیائے اسلام جب سرمایہ داری سے روشناس ہوئی، تو اس وقت تک سرمایہ داری پر یورپ کا مخصوص رنگ پوری طرح چڑھ چکا تھا۔ دوسری طرف اسلامی دنیا پر ادبار اور زوال کا غلبہ تھا اور اس میں ہر طرف جہالت، غربت اور پسماندگی کے آثار نمایاں تھے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی درآمد سے اسلامی دنیا میں کچھ مادی ترقی بھی ہوئی جس نے بعض لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ اسلام سرمایہ داری کا حامی ہے اور اس کی موجودہ صورتِ میں اس کی تمام خوبیوں سمیت اپنا لینے میں وہ کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ سرمایہ داری اسلام کے کسی بنیادی اصول اور قانون سے متصادم نہیں ہے، بلکہ اسلام میں افراد کو ذاتی ملکیت کا جو حق حاصل ہے، وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اسلام سرمایہ داری کے خلاف نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ اسلام پر بہت بڑا بہتان ہے۔ اس کے جواب میں ہم سرمایہ داری کے ان حامیوں سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سرمایہ داری نظام سودی کاروبار اور اجارہ داری کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ مگر اسلام ان دونوں کے خلاف ہے اور اس نے آج سے ہزاروں برس پیشتر ان کی حرمت اور ممانعت کا صاف صاف اعلان بھی کر دیا تھا۔ صرف یہی بات اسلام اور سرمایہ داری کے گہرے اصولی اور بنیادی اختلاف کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔ ماہرین معاشیات کے درمیان اس بات پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کارل مارکس جیسے سرمایہ داری کے شدید دشمن بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ابتدائی دور میں سرمایہ دارانہ نظام سے انسانیت کو بڑا فائدہ پہنچا اور دنیا اس کی بدولت ترقی کی نئی منزلوں سے آشنا ہوئی۔ مادی پیدوار میں اضافہ ہوا، وسائل نقل وحمل بہتر ہوئے اور وسیع پیمانے پر قومی وسائل کا استعمال عام ہوا اور مزدوروں کا معیارِ زندگی پہلے سے جب کہ ان کا تمام تر دارومدار زراعت پر تھا، کہیں زیادہ بلند ہو گیا۔ مگر یہ سرمایہ داری کا یہ دور جلد ہی ختم ہو گیا۔ کیوں کہ اس کے فطری ارتقاء کے نتیجے میں دولت بتدریج سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں آ گئی اور غریب اور مزدور اپنی جائیداد اور دولت غرض سب کچھ سے محروم ہو گئے۔ اس سے سرمایہ داروں کو مزدور حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی۔ جن کی محنت کے طفیل ان کی دولت اور تجارت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

سرمایہ داری کے ابتدائی دور میں اس سے انسانیت کو جو فوائد پہنچے اور جو مادی ترقی اور خوش حالی حاصل ہوئی اسلام ان میں سے کسی کی نفی نہیں کرتا اور نہ وہ ان میں سے کسی کے خلاف ہے۔ لیکن اگر دنیائے اسلام میں سرمایہ داری کا ظہور ☆ ہوتا تو اسلام اس کو یونہی آزاد کبھی نہ چھوڑتا بلکہ ایسے قوانین اور اصول مرتب کرتا جن کی موجودگی میں استحصال بے جا کا کوئی خطرہ ہی نہ رہتا، خواہ اس کا باعث سرمایہ داروں کی بدنیتی ہوتی یا سرمائے کی ناگزیر طبعی خصوصیت کے نتیجے میں اس کا ظہور

☆ اسلام کا اپنا ایک معاشی نظام ہے جس کے اصول وقوانین معین ہیں۔ ان قوانین کی روشنی میں کوئی بے خدا نظام پنپ ہی نہیں سکتا۔ چہ جائے کہ کسی نظام کا اس میں ظہور ہوتا۔ [الاعتصام] لہٰذا یہ مفروضہ ہی درست نہیں۔

ہوتا۔ چناں چہ اسلام نے اس سلسلے میں ہمیں جو اصول دیا ہے، اس کی رو سے سرمایہ دار کے ساتھ مزدور کو بھی منافع میں سے حصہ ملنا چاہیے۔ چناں چہ امام مالک تو مزدور کو مالک کے ساتھ منافع میں مساوی حصے کا مستحق سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے کمانے میں جتنا سرمایہ دار کے سرمائے کا حصہ ہے اتنا ہی مزدور کی محنت کو بھی دخل حاصل ہے۔ لہٰذا دونوں کو منافع میں سے مساوی حصہ ملنا چاہیے۔

اسلامی فقہ کے اس اصول سے ظاہر ہے ہوتا ہے کہ اسلام کو معاشرتی انصاف کے قیام سے کس قدر گہری دلچسپی ہے۔ مگر معاشرتی انصاف کے قیام کا یہ داعیہ اسلام میں کسی مادی ضرورت، مجبوری، یا طبقاتی کشمکش (جو کہ بعض لوگوں کے نزدیک معاشی تعلقات اور وابط کی ترقی اور بہتری کا واحد موثر عامل ہے) کے نتیجے میں نہیں ابھرا تھا، بلکہ یہ سراسر اس کی اپنی داخلی تحریک کا ثمر تھا۔

ابتدائی دور میں صنعت وحرفت نہایت سیدھی سادی ہوتی تھی اور لوگ زیادہ تر کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ اسلام کے مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں اگر اس وقت محنت اور سرمائے کے باہمی رشتوں کو منضبط کیا جاتا تو ان کو ایک منصفانہ بنیاد مل جاتی اور ان میں وہ خرابیاں پیدا نہ ہوتیں، جو یورپ میں رونما ہوئیں۔ ماہرین معاشیات ہمیں بتاتے ہیں کہ سرمایہ داری نظام جب سے اپنے ابتدائی ''دور خیر'' سے نکل کر اپنے موجودہ ''دورِ شر'' میں داخل ہوا ہے، قومی قرضوں پر اس کا انحصار بہت بڑھ گیا ہے۔ چناں چہ بینک قائم ہوئے اور انہوں نے اپنا مالی کاروبار اس طرح استوار کیا کہ وہ سود لے کر حکومتوں کو قرضے مہیا کرنے لگے۔ بینکوں کے کاروبار کی مالی اور فنی پیچیدگیوں میں پڑے بغیر ہم قارئین کے سامنے جو حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں وہ صرف اتنی ہے کہ یہ قرضے اور بینکوں کا زیادہ تر کاروبار سود کی اساس پر چل رہا ہے۔ جس کی اسلام نے صاف اور واضح الفاظ میں ممانعت کی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی دوسری خصوصیت شدید کاروباری مسابقت ہے جس کے نتیجے میں چھوٹے چھوٹے کاروباری ادارے تباہ ہو جاتے ہیں یا پھر متحد ہو کر وہ بڑے بڑے کاروباری ادارے قائم کر لیتے ہیں تا کہ دوسرے اداروں سے مقابلہ کر سکیں۔ یہیں سے اجارہ داری (Monopoly) وجود میں آتی ہے۔ مگر اسلام اس اجارہ داری کا بھی مخالف ہے۔ چناں چہ پیغمبر اسلام ﷺ کا ارشاد ہے:

من احتکو فھو خاطئ ۔ [مسلم، ابوداؤد، ترمذی]

''اجارہ داری قائم کرنے والا گنہگار ہے۔''

یہ ہیں سرمایہ داری کی دو بڑی بنیادیں۔ اسلام ان دونوں کا اصولاً مخالف ہے جس کے بعد اسلام کے خلاف سرمایہ داری ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ البتہ اگر سرمایہ داری کا ظہور اسلام کے زیر سایہ ہوتا تو اس کے موجودہ ''دورِ شر'' کی خرابیاں رونما نہ ہوتیں اور نہ سرمایہ داری یوں استحصال بے جا، نو آبادیاتی نظام اور جنگ وتباہی کی ہم معنی بن کر رہ جاتی۔

اگر اسلامی دنیا میں صنعتی انقلاب رونما ہوتا تو اسلام کو اسے اپنے رنگ میں رنگنے میں ہرگز کوئی الجھن پیش نہ آتی۔ وہ صنعت وحرفت کو چھوٹے چھوٹے کارخانوں تک جن کا منافع مالک اور مزدور آپس میں تقسیم کر لیتے تھے، محدود رکھنے پر اصرار نہ کرتا، بلکہ اس کے زیر سایہ پیداوار بڑھ جاتی۔ مگر مالک اور مزدوروں کے تعلقات کی وہ نوعیت ہرگز نہ ہوتی جو انیسویں اور بیسویں صدی کے یورپ میں نظر آتی ہے۔ اس کے بجائے ان کے باہمی تعلق کی بنیاد اس اصول پر استوار ہوتی، جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں اور جو مالک اور مزدور کو منافع میں ایک دوسرے کے ساتھ برابر کا شریک قرار دیتا ہے۔

اس اسلامی طریقے پر عمل پیرا ہونے کے بعد سود اور اجارہ داری کا بالکل خاتمہ ہو جاتا اور مزدوروں کو اس بے انصافی، افلاس اور ذلت سے دوچار نہ ہونا پڑتا جن سے یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام میں وقتاً فوقتاً دوچار ہوتے ہیں۔ اسلام کے متعلق یہ خیال کہ اس طرح کے معاشرتی انصاف کے قیام کے لیے اشتراکیت کی طرح اسے بھی آزمائشوں، طبقاتی کشاکش اور اقتصادی دباؤ سے لازماً دوچار ہونا پڑتا، جس کے بعد اس کے قوانین میں خود بخود کچھ ترمیم وتنسیخ واقع ہو جاتی، ایک احمقانہ تصور ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کس طرح اسلام کو غلامی، جاگیرداری اور

ابتدائی سرمایہ داری کے مسائل سلجھانے میں دنیا کے تمام دوسرے نظاموں پر فوقیت حاصل ہے۔ اسلام نے آ کر جتنی اصلاحات بھی کیں، ان کا محرک کوئی خارجی دباؤ ہرگز نہیں تھا، بلکہ ان کے پیچھے اسلام کے اپنے ابدی اصول حق وانصاف کارفرما تھے، جن کا تمسخر اشترا کی مصنفین اپنی تحریروں میں اڑانے کے عادی ہیں۔ اس کے برعکس یہ واقعہ ہے کہ خود روس بھی جس کو مثالی اشترا کی مملکت قرار دیا جاتا ہے، جاگیرداری کے دور سے نکلنے کے بعد اگلے مرحلے یعنی سرمایہ داری کے دور میں سے گزرے بغیر ہی اشترا کیت کے دور میں داخل ہو گیا۔ گویا یوں روس نے جو کارل مارکس کے فلسفے کا پرچارک ہے، خود اپنی عملی مثال سے اس کے اس نظریہ کی تردید کر دی ہے کہ ہر انسانی معاشرے کو اپنے ارتقاء کے دوران لازماً کچھ مخصوص ادوار میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

جہاں تک نوآبادیاتی نظام، جنگوں، دوسری قوموں کے استحصال اور سرمایہ داری کی لائی دوسری عالمگیر برائیوں کا تعلق ہے، اسلام ان سب کے خلاف ہے۔ اپنی نوآبادیات قائم کرنے یا دوسروں کو اپنی اغراض کا آلہ کار بنانے کی غرض سے ان کے خلاف جنگ کرنا بھی اسلام پسند نہیں کرتا۔ اسلام صرف ایک جنگ کی اجازت دیتا ہے اور وہ ہے ظلم وجارحیت کے خلاف جنگ یا پرامن ذرائع مسدود ہونے کی صورت میں اعلاء کلمۃ الحق کی خاطر جہاد! تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جنگوں کے باب میں اسلام دنیا کا سب سے پاکیزہ نظام ہے۔ اسلامی جنگوں کے نتیجے میں کبھی کسی قوم کو استحصال بے جا کا نشانہ نہیں بنایا گیا اور نہ کسی پر غلامی کی لعنت مسلط کی گئی۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر اسلامی دنیا میں صنعتی انقلاب رونما ہوا ہوتا تو فاضل پیداوار (Surplus Production) کے مسئلے کو اسلام پرامن طور پر سلجھا لیتا اور اس کو اس غرض کے لیے نہ دنیا کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنے کی ضرورت پیش آتی اور نہ اس پر نوآبادیاتی سامراج کو مسلط کرنے کی۔ واقعہ یہ ہے کہ فاضل پیداوار کا مسئلہ سرمایہ دارانہ نظام کی موجودہ بگڑی ہوئی صورت کا شاخسانہ ہے۔ بالفاظ دیگر اگر سرمایہ داری کے بنیادی اصولوں کو بدل دیا جائے تو فاضل پیداوار کا مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔

سرمایہ دارانہ نظام میں حکومت ارتکازِ دولت کے معاملے میں بالکل بے بس ہوتی ہے۔ مگر اسلامی نظام میں حکومت اس معاملے میں یوں بے بس یا غیر جانبدار تماشائی نہیں ہوتی، بلکہ اس بات کی ضامن ہوتی ہے کہ دولت سمٹ کر اس طرح سے صرف خاندانوں میں محدود نہ ہو جائے کہ باقی تمام ملک غربت اور محرومی کا شکار ہو جائے۔ ایسی صورت حال کا پیدا ہونا شریعت اسلامی کے منشاء کے خلاف ہے۔ کیوں کہ وہ چاہتی ہے کہ دولت کی گردش چند لوگوں تک ہی محدود نہ ہو۔ بلکہ اتنی عام ہو کہ تمام انسان اس سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔ اسلام میں حکمران کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی پر زیادتی اور ظلم کیے بغیر شریعت اسلامی کو نافذ کرے۔ اس غرض کے لیے اس کو خدا کی مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں تاکہ وہ خدا کے اس قانون کو جاری وساری کر سکے جس کے نفاذ کے بعد دولت، چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ ہی نہیں سکتی۔

اسلام کا قانونِ وراثت شریعت اسلامی کے اسی مزاج کو ظاہر کرتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک نسل اپنے پیچھے جو دولت اور جائیداد چھوڑے وہ بعد میں آنے والی نسل میں مناسب طور پر تقسیم ہو۔ یہی حال زکوٰۃ کا ہے، جس میں سالانہ آمدنی اور نفع کا اڑھائی فیصد حصہ غریبوں کی فلاح وبہبود کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ مزید برآں اسلام صاف اور صریح الفاظ میں زراندوزی کی ممانعت کرتا ہے اور ساتھ ہی سود کو بھی جو زراندوزی کا سبب بنتا ہے، حرام قرار دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسلام معاشرے کے مختلف افراد کے باہمی تعلقات کو باہمی استحصال کے بجائے باہمی ذمہ داری کی اساس پر استوار کرتا ہے۔

نبی ﷺ کے ارشاد کے مطابق اسلامی مملکت اپنے عمال کی بنیادی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ چناں چہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

”جو شخص ہماری (یعنی ریاست اسلامی کی) کوئی خدمت انجام دینے پر مامور ہے، اگر وہ غیر شادی شدہ ہے، تو اس کی شادی

کرائی جائے گی۔ اگر اس کے پاس رہنے کو مکان نہ ہو، تو مکان دیا جائے گا۔ خادم نہ ہو تو خادم دیا جائے گا اور اگر سواری کے لیے اس کے پاس کوئی جانور نہ ہو تو اس کی سواری کے لیے جانور بھی مہیا کیا جائے گا۔''

بنیادی ضروریاتِ زندگی کی یہ ضمانت اسلامی ریاست کے عمال تک ہی محدود نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ تو ہر انسان کی ضرورتِ حیات ہیں اور ہر وہ فرد ان کا مستحق ہے، جو اسلامی ریاست یا معاشرے کی کوئی خدمت کسی حیثیت میں بھی انجام دیتا ہے۔ لہٰذا اگر اسلامی ریاست اپنے عمال کو یہ سہولتیں فراہم کرنے کا ذمہ لیتی ہے، تو معاشرے کے تمام دوسرے کارکنوں کو بھی اسے ویسی ہی سہولتیں مہیا کرنی چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست سرکاری خزانے سے ان تمام افراد کی کفالت کرتی ہے، جو بڑھاپے، بیماری یا کم سنی کی وجہ سے اپنی روزی آپ کمانے کے قابل نہیں ہوتے۔ اس طرح ان لوگوں کو بھی سرکاری خزانے سے مالی اعانت دی جاتی ہے، جن کے ذرائع آمدنی محدود اور ناکافی ہوتے ہیں۔

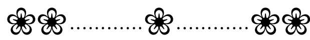
یہ تمام حقائق ثابت کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست اپنی حدود میں رہنے والے تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ جو طریقہ کار اختیار کرتی ہے وہ چنداں اہم نہیں۔ اصل اہمیت اسلامی ریاست کے اس بنیادی اصول کی ہے جو قومی نفع اور نقصان میں قوم کے تمام افراد کو برابر کا شریک قرار دیتا ہے۔ اس سے کارکن اور مزدور نہ صرف دوسروں کے استحصال بے جا سے محفوظ ہو جاتے ہیں بلکہ صاف ستھری زندگیاں بھی گزار سکتے ہیں۔

اسلام کے زیر سایہ سرمایہ داری کی وہ مکروہ صورت پیدا ہی نہیں ہوسکتی تھی جو آج کے ''مہذب'' مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں نظر آتی ہے۔ شریعت اسلامی کا کوئی قانون، خواہ وہ شارع علیہ السلام سے ماخوذ ہو یا بعد میں حالات کے اقتضاء سے حدودِ شریعت میں رہ کر اجتہاد کر کے بنایا گیا ہو، سرمایہ داروں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ محنت کاروں کو اپنی ہوس زرگری کی بھینٹ چڑھا دیں۔ اسلام میں سرمایہ داری کی دوسری لعنتیں مثلاً نو آبادیاتی سامراج، جنگیں اور غلامی وغیرہ بھی کبھی سر نہ اٹھا سکیں۔ معیشت کے سلسلے میں اسلام صرف اچھے اچھے قانون اور ضابطے بنا دینے ہی کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ ان کے ساتھ ساتھ وہ انسان کے ان اخلاقی اور روحانی جذبات سے بھی اپیل کرتا ہے، جنہیں کمیونسٹ (Communist) صرف اس لیے تمسخر کا نشانہ بناتے رہتے ہیں کہ یورپ کی تاریخ ان کی عملی افادیت کی تمام علامتوں سے خالی ہے۔

بہر حال اسلام کے نزدیک اخلاقی اور روحانی اقدار انسان کی عملی زندگی سے الگ نہیں ہوتیں۔ اسلام اس لحاظ سے ایک منفرد نظامِ حیات ہے کہ وہ روح کی پاکیزگی اور معاشرے کی تنظیم کو باہم ایک دوسرے سے مربوط اور ہم آہنگ کر دیتا ہے وہ نہ معاشرے کو نظر انداز کرتا ہے اور نہ فرد کو خلا میں چھوڑتا ہے کہ نظریے اور عمل میں مطابقت پیدا کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں قانون اور اخلاق میں کبھی تضاد پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں، پہلو بہ پہلو چلتے ہیں اور ایک پہلو میں جو کمی رہ جاتی ہے وہ دوسرے سے پوری ہو جاتی ہے اور ان میں کبھی کوئی کشمکش یا تناقض کی صورت رونما نہیں ہوتی۔

اسلام انسان کو جس روحانی سربلندی سے ہمکنار کرتا ہے وہ ایسے اقتصادی قوانین کے نفاذ کو آسان بنا دیتی ہے جن سے سرمایہ داری کی جملہ خرابیوں کا قلع قمع کیا جاسکتا ہے۔ چناں چہ اسلامی معاشرے میں جب عملاً ان قوانین کا نفاذ کیا جاتا ہے تو معاشرے کے افراد ان پر برضا ورغبت عمل کرتے ہیں۔ ان کے اس عمل کا محرک سزا کا کوئی خوف نہیں ہوتا بلکہ ان کا اپنا اخلاقی احساس ہوتا ہے۔ کیوں کہ جو ان کے ضمیر کی آواز ہوتی ہے وہی قانون کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔

آخر میں ہم یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ سرمایہ داری کی وہ مکروہ صورت جو اس وقت اسلامی دنیا پر مسلط ہے۔ اس کا اسلامی نظام سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں۔ اس لیے اس کی پھیلائی ہوئی خرابیوں کے لیے کسی طرح بھی اسلام کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔



تبصرۂ کتب

تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے

سیرۃ البخاری

مصنف: حضرت مولانا عبدالسلام مبارک پوری
تعلیق وتخریج: ڈاکٹر عبدالعلیم عبدالعظیم بستوی
ناشر: ادارہ نشریات ۴۰۔ اردو بازار۔ لاہور
صفحات: ۵۰۸۔ بڑا سائز، اچھی کمپوزنگ، بہترین کاغذ، عمدہ طباعت، خوب صورت اور مضبوط جلد
تبصرہ نگار: محمد اسحاق بھٹی

نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ کی جمع وتدوین کا سلسلہ آپ کی حیات طیبہ ہی میں شروع ہوگیا تھا جن مختلف صحابہ کرام نے یہ خدمت سرانجام دی اور احادیث لکھیں، تدوین حدیث کی اصطلاح میں ان کی مکتوبہ احادیث کو ''صحیفہ'' کہا جاتا ہے۔ مثلاً صحیفہ ابوبکر، صحیفہ عمر، صحیفہ جابر بن عبداللہ، صحیفہ عائشہ، صحیفہ علی، صحیفہ عمرو بن عاص۔ صحابہ کرام کے بعد یہ سلسلہ آگے بڑھا اور ان کے شاگردانِ عالی قدر (تابعین) تک پہنچا۔ انھوں نے بھی احادیث کی حفاظت وتدریس کو اپنا مقصد حیات قرار دیا۔

پھر تابعین کے شاگردوں (تبع تابعین) نے اس خدمت کو اپنے شب وروز کا معمول بنایا۔ اس طرح بہت جلد کم احادیث کی ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جنھوں نے ذخیرۂ احادیث کو خاص ترتیب اور ابواب کے ساتھ موضوع وار کتابی شکل میں جمع کردیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے متعدد ضخیم کتابیں شائقین حدیث کے سامنے آگئیں۔ انہی ضخیم کتابوں میں ایک اہم کتاب ''الجامع الصحیح'' کے نام سے موسوم ہے، جس نے صحیح بخاری کے مختصر نام سے شہرت پائی اور ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' کہلائی۔

الجامع الصحیح کے مرتب ومصنف کا اسم گرامی محمد ان کے والد ذی مرتبت کا نام نامی اسماعیل اور دادا کا ابراہیم ہے اور ان کا مسکن ہے بخارا۔ یعنی محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بخاری۔

امام بخاری ۱۳۔ شوال ۱۹۴ھ کو جمعۃ المبارک کے روز عشا کے بعد بخارا میں پیدا ہوئے۔ قد وقامت میں اعتدال وتوازن کا صحیح ترین پیکر تھے۔ یعنی نہ زیادہ مائل بہ طوالت اور نہ کوتاہ قامت۔ ذہانت وذکاوت کے مرتبۂ علیا پر فائز تھے اور زہد واتقا اور علم وادراک میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ صحیح بخاری لکھنے کی طرف کیوں کر راغب ہوئے۔

اس کے بارے میں خود فرماتے ہیں:

كنت عند اسحاق بن راهويه فقال لي بعض اصحابه لو جمع احد كتاباً مختصراً في سنن الصحيحة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم التي بلغت من الصحابة اقصٰى درجاتها كان احسن وتيسر العمل عليها للعاملين من دون مراجعة الى المجتهدين قال فوقع ذالك في قلبي واخذ بمجامع خاطري فصنفت هذا الجامع الصحيح۔

یعنی میں اسحاق بن راہویہ کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ ان کے شاگردوں میں سے ایک صاحب نے (یا ایک اور روایت کے مطابق خود انھوں نے) کہا: اگر کوئی شخص نبی ﷺ کی سنن صحیحہ کے بارے میں جو صحابہ سے پہنچی ہیں ایک مختصر مگر صحیح ترین کتاب مرتب کردے تو یہ نہایت عمدہ کام ہوگا۔ اس کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ عمل کرنے والوں کے لیے اس میں سہولت پیدا ہوجائے گی۔ وہ فقہائے مجتہدین کی طرف مراجعت کے بغیر حقیقت حال سے مطلع ہوسکیں گے۔ میں نے یہ بات سنی تو دل میں ایسی بیٹھی کہ میں نے یہ جامع اور صحیح کتاب مرتب کردی۔

حافظ ابن حجر کے بقول صحیح بخاری میں مندرج احادیث کی تعداد ۷۳۹۷ تک پہنچتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو امت میں بے پناہ قبولیت عطا فرمائی۔ اور امام بخاری نے احادیث کی صحت کے بارے میں جو اہتمام فرمایا اس کی بنا پر حلقہ محدثین میں انھیں امیر المومنین فی الحدیث، امام المحدثین، سید المحدثین، طبیب الحدیث، استاذ المحدثین، استاذ الاساتذہ، ناصر الاحادیث المصطفویہ اور ناشر المواریث المحمدیہ ایسے القاب عطا کیے گئے۔

بہت سے اہل علم نے صحیح بخاری کی شرحیں لکھیں اور اس کتاب کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی۔ عربی اور اردو کے علاوہ انگریزی، فارسی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے۔ اب تک تقریباً اڑھائی سو کتابیں اس کے مختلف گوشوں کی وضاحت میں ضبط تحریر میں آ چکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

بعض غیر مسلموں نے بھی اس کے بعض پہلوؤں کو لائق اعتنا ٹھہرایا۔ صحیح بخاری کی شروح وتراجم کے علاوہ اس کے مصنف امام بخاری رحمہ اللہ کے حالات میں بھی کتابیں لکھی گئیں۔ مگر وہ کتابیں عربی زبان میں ہیں، جن سے عربی دان حضرات ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اردو زبان میں امام کے متعلق مجلّات وجرائد میں بعض حضرات نے مضامین بے شک لکھے۔ چھوٹے چھوٹے چند رسائل بھی شائع ہوئے۔ لیکن مفصل کتاب صرف ایک ہی شائع ہوئی اور وہ کتاب ہے ''سیرۃ البخاری'' جو اس وقت ہمارے پیش نگاہ ہے۔ اس کے مصنف ہیں حضرت مولانا عبدالسلام مبارک پوری۔ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگردِ رشید، حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کے قریبی عزیز اور شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی کے والد مکرم۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت امام سے متعلق مندرجات کے اعتبار سے یہ کتاب (سیرۃ البخاری) عربی کتابوں سے بازی لے گئی ہے۔ صاحب تحقیق مصنف کی نہایت محققانہ تصنیف جس میں حضرت امام کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ اس طرح اسے اس موضوع کے دائرۃ المعارف یا انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت حاصل ہے۔

مولانا عبدالسلام مبارک پوری کتابیں خریدنے اور پڑھنے کے بے حد شائق تھے۔ ۱۹۲۴ء میں وہ دارالحدیث رحمانیہ (دہلی) کے منصب شیخ الحدیث پر متمکن تھے۔ دہلی کی جامع مسجد کا علاقہ تاجرانِ کتب کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ کتابیں خریدنے کے سلسلے میں مولانا ممدوح کی وہاں آمد ورفت رہتی تھی۔ ۲۴۔ فروری ۱۹۲۴ء کو وہاں سے ایک کتاب خریدی۔ اسے پڑھتے ہوئے واپس آ رہے تھے کہ چاندنی چوک گھنٹا گھر کے قریب ایک گھوڑا گاڑی بغیر سوار کے تیزی کے ساتھ دوڑتی ہوئی آ رہی تھی کہ مولانا اس کی زد میں آ کر وہیں واصل حق ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی کتاب ''سیرۃ البخاری'' کی ہمہ گیر افادیت کے پیش نظر ہندوستان کے مشہور مصنف ومترجم ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی نے اسے عربی کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ ترجمے کے ساتھ ساتھ انہوں نے بے شمار مقامات پر تعلیقات وحواشی لکھے ہیں اور تخریج کی خدمت بھی سرانجام دی ہے۔ یہ بے حد محنت طلب تحقیقی کام ہے جو لائق مترجم نے کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ کتاب عرب اصحاب علم کے مطالعہ میں آئی اور وہ امام بخاری کے متعلق ایک ہندوستانی فاضل مصنف کی معلومات سے آگاہ ہوئے۔ (ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی کے حالات میں نے اپنی کتاب ''دبستانِ حدیث'' میں لکھے ہیں۔)

زیر تبصرہ کتاب ''سیرۃ البخاری'' (جو ادارہ نشریات اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع کی گئی ہے) کا اردو متن تو وہی ہے جو حضرت مصنف مولانا عبدالسلام مبارک پوری مرحوم ومغفور کا رقم فرمودہ ہے، لیکن اس کے مترجم ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی نے جو اضافات یا تخریجات وحواشی لکھے ہیں، انھیں اردو متن کا حصہ بنا دیا گیا ہے اور ان حواشی وتعلیقات وغیرہ کو خود عربی مترجم نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ اس طرح یہ ایڈیشن بے حد اہمیت اختیار کر گیا ہے اور پہلے اردو ایڈیشنوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ اضافات وحواشی ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مدرسین وطلبا کے لیے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ ہمارے مدارس میں صحیح بخاری کے درس وتدریس کا سلسلہ اللہ کے فضل سے ہمیشہ جاری رہتا ہے، اس لیے اس کتاب سے استفادہ ضروری ٹھہرا۔ اس میں صحیح بخاری اور امام بخاری کے بارے میں تو تفصیلات ہیں

ہی، اس کے علاوہ اصحاب الحدیث اور کتب احادیث کے متعلق بہت سی اہم معلومات بیان کی گئی ہیں۔

ادارہ نشریات نے ۵۰۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب اپنی روایت طباعت کے مطابق خوب صورت انداز میں شائع کی ہے۔ ''حرفِ اوّل'' کے عنوان سے بائیس صفحات میں پھیلا ہوا پروفیسر عبدالجبار شاکر کا مقدمہ ہے جو کتاب، صاحب کتاب، ان کے خاندان اور ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی کے بارے میں بہت سی معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

❀❀............❀............❀❀

حقوق رحمۃ للعالمین ﷺ

تالیف: حضرت مولانا محمد اقبال کیلانی حفظہ اللہ

ضخامت: ۲۰۸ صفحات

قیمت: ۱۱۰

ناشر: حدیث پبلی کیشنز، ۲۔ شیش محل روڈ، لاہور

تبصرہ نگار: محمد سلیم چنیوٹی

اللہ تعالیٰ نے قصر نبوت کی آخری اینٹ کے طور پر جناب رسولِ اکرم ﷺ، پیغمبر رحمت، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ آپ ﷺ کا مقام ومرتبہ مسلمانوں کے نزدیک، سب انبیائے عظام سے بلند وبرتر ہے۔ آپ ﷺ کی ذات بابرکات کے فضائل ومناقب اتنے زیادہ ہیں کہ شمار نہیں کیے جاسکتے۔

زیر تبصرہ کتاب کے مؤلف حضرت مولانا محمد اقبال کیلانی حفظہ اللہ نے ''تفہیم السنۃ'' کے نام سے اپنی تالیفات کا ایک سلسلہ مبارکہ شروع کیا ہوا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ''حقوق رحمۃ للعالمین'' اس سلسلے کی چوبیسویں پیش کش ہے۔ اللہ کریم نے مؤلف موصوف کے قلم کو قرآن وحدیث کی خدمت کے لیے وقف کرلیا ہے۔

زیر نظر کتاب میں مؤلف موصوف نے جناب نبی رحمت ﷺ کے دس حقوق کا تذکرہ کیا ہے۔ ان حقوق کے عناوین حسب ذیل ہیں:

آپ ﷺ پر ایمان، اتباع رسول ﷺ، آپ ﷺ سے محبت، آپ ﷺ کا دفاع، آپ ﷺ کے دین (اسلام) کی نصرت، آپ کا ادب، آپ پر درود وسلام بھیجنا، آپ ﷺ کے دوستوں سے دوستی اور آپ ﷺ کے دشمنوں سے دشمنی، آپ ﷺ کے اصحاب اور آلِ رسول سے محبت، آپ سے بے وفائی وجفا نہ کرنا وغیرہ۔ کتاب کے آخر میں مؤلف نے آپ کی توہین کرنے والے کی سزا کا ذکر کیا ہے۔

کتاب کے صفحہ ۵۵ پر ''اہل مغرب کا پیغمبر اسلام ﷺ سے تعصب اور ہماری ذمہ داریاں'' کے عنوان پر ایک ضمیمہ بھی ترتیب دیا ہے جو پینتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ضمیمے میں اہل مغرب نے جو جھوٹا پروپیگنڈا اور دشمنی کے طور پر جو گستاخیاں اور بغض رسالت ﷺ میں مبتلا ہو کر گزشتہ دنوں کارٹون وغیرہ شائع کیے تھے، اس ضمن میں مؤلف نے مسلمانوں کو آپ ﷺ سے محبت واطاعت کرنے کے علاوہ دیگر ذمہ داریاں بھی یاد دلائی ہیں۔ اس ضمیمے میں اسلام کے ساتھ دیگر مذاہب کا تقابل بھی پیش کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے اسلام کی حقانیت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

مسلمان جس طرح نبی کریم ﷺ اور دیگر انبیاء کے درمیان کوئی

فرق نہیں کرتے بلکہ تمام رسولوں و فرستادوں سے محبت و عقیدت رکھتے ہیں۔ اور ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ جب کہ ملت کفر جناب رسالت مآب سے دشمنی اور کینے سے باز نہیں آتے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ مسلمان متحد ہو کر حرمت رسول ﷺ کی خاطر ان کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جائیں۔

اس پوری کتاب میں انہی تعلیمات کا تذکرہ ہے سطر سطر محبت رسول ﷺ سے سرشار باحوالہ، مدلل، آیاتِ قرآنیہ واحادیث مبارکہ سے مزین ہے۔

کتاب کمپیوٹر کمپوزنگ، کارڈ کور اور موٹے فونٹ میں ترتیب دی گئی ہے۔

دعا ہے اللہ کریم مؤلف موصوف، ناشر و دیگر معاونین کو اس کتاب پر کی گئی محنت کو قبول فرمائے اور حشر میں شفاعت پیغمبر نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین



امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ایک عظیم مصلح

مؤلف: حضرت مولانا فضل الرحمٰن بن محمد الازہری حفظہ اللہ

ضخامت: ۲۷۲ صفحات

قیمت: ۲۵۰/- روپے

ناشر: ریز مشینری سٹور نشتر روڈ، لاہور

تبصرہ نگار: محمد سلیم چنیوٹی

شیخ الاسلام علامہ ابوالعباس احمد بن الشیخ شہاب الدین عبدالحلیم ابن تیمیہ الحرانی رحمہ اللہ محتاجِ تعارف شخصیت نہیں ہیں۔ آپ ایک عالم دین، حافظ قرآن، قاطع شرک و بدعت، مجاہد فی سبیل اللہ، محبّ نبی ﷺ، عظیم مصلح اور امت محمدیہ ﷺ کے سچے خیر خواہ تھے۔ آپ اسلام کے ایک بے باک ترجمان، علومِ اسلامیہ کے شناور، رسوم و بدعات کے خلاف شمشیر برہنہ تھے، جہاں آپ لوگوں کی رہنمائی اسلام کی طرف فرماتے تھے اور لوگ یعنی اہل توحید آپ کے گرویدہ تھے، وہاں آپ کے دشمن بھی بہت تھے۔ آپ ایک کثیر التصانیف عالم ہونے کے ناطے اپنے

مخالفین کے ساتھ علمی و دینی مسائل پر بھی طبع آزمائی فرماتے رہتے تھے۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب الازہری حفظہ اللہ ایک کثیر المطالعہ شخصیت ہیں۔ان کا بیشتر وقت مطالعہ کرنے اور تصنیف و تالیف کے شغل میں گزرتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ پر انہوں نے زیر تبصرہ کتاب بڑی محنت، جستجو اور عرق ریزی سے تالیف فرما کر اہل علم کے اہل ذوق طلباء و اساتذہ کے لیے بہترین مواد مہیا فرما دیا ہے۔

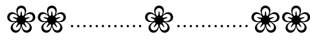
اس کتاب میں علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی ابتدائی زندگی، تاتاری جنگوں کا مفصل تذکرہ، چنگیز خان کے مظالم اور دیگر تاتاری جرنیلوں اور افواج کے حملوں کی داستان جمع کی گئی ہے۔ نیز علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے میدانِ جہاد میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے اور مسلمانوں کو اس تاتاری فتنے سے بچانے میں کردار ادا کیا اس کا مفصل تذکرہ کیا گیا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی شرک و بدعت کے خلاف مساعی جمیلہ اور اہل بدعت و جماعت صوفیا کی بے جا مخالفت اور حسد کا بھی تذکرہ ہے۔

عیسائیوں نے مسلمانوں کو ہمیشہ مشکلات سے ہی دوچار کیا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے دور میں بھی انہوں نے امت مسلمہ کو ہر طرح زچ کیا۔ علامہ ابن تیمیہ نے عیسائیوں کے ہر سوال اور اسلام پر اٹھائے گئے ہر اعتراض کا مدلل جواب دے کر ان کی علمی برتری کو خاک میں ملا دیا اور ان کی سازشوں کا ہر موڑ پر ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ آج کے ماحول میں بھی یہ کتاب مشعل راہ ہے کیوں کہ آج پھر ایک بار مسلمانوں کو عیسائیت سے پالا پڑا ہے۔

حضرت مولانا الازہری حفظہ اللہ نے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی حیات مبارکہ پر یہ ایک بڑی مدلل، مختصر مگر جامع اور عام فہم کتاب لکھ کر قابل ستائش خدمت انجام دی ہے۔ اہل ذوق ضرور اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

کتاب کمپیوٹر کمپوزنگ، عمدہ سفید کاغذ، مجلد ڈائی دار ٹائٹل ہے۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

اجازۃ روایۃ الحدیث کی تقریب سعید

دار العلوم المحمدیہ لوکو ورکشاپ مغلپورہ لاہور سے "صحیح بخاری" پڑھ کر فارغ ہونے والے علماء کے لئے شروع سے لیکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک مکمل واسطوں کے ساتھ ایک خوبصورت سندِ اجازہ تیار کرائی گئی ہے۔ یہ سند جاری کرنے کے لئے دار العلوم ھذا میں ایک پروقار تقریب کا انعقاد کیا گیا ہے۔ جس میں



علماءِ کرام سند میں مذکور چند محدثین کی خدمات کے بارے میں خطاب فرمائیں گے۔

اور دیگر علماءِ کرام تشریف لا رہے ہیں۔

دار العلوم سے فارغ ہونے والے علماءِ کرام فوری طور پر ادارہ میں رابطہ کر کے اپنا نام مع ایڈریس لکھوائیں تاکہ پروگرام سے پہلے آپ کی سند مکمل کی جا سکے۔ اور جن رفقاءِ درس کے ساتھ رابطہ ممکن ہو ان کو پروگرام سے مطلع کریں۔ اساتذہ کرام اور اپنے مادر علمی کے ساتھ وابستگی کا ثبوت دیتے ہوئے پروگرام میں اپنی شرکت یقینی بنائیں۔

پروگرام: 19 جولائی 2009ء بروز اتوار صبح 10 بجے

الداعی الی الخیر
محمد عبداللہ رفیق
0322 8067564
042 36852070
36813434

شانِ سکندری

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے!
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے!

بتوں سے تجھ کو امیدیں ، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں روش بندہ پروری کیا ہے!

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے!

اسی خطا سے عتاب ملوک ہے مجھ پر
کہ جانتا ہوں مآل سکندری کیا ہے!

کسے نہیں ہے تمنائے سروری ، لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے!

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے ، شاعری کیا ہے!

[علامہ اقبال رحمہ اللہ]